اِنقلابِ اِسلام

(مُسلمانانِ عالم کا سیاسی پس منظر)

٭

ایم - اَسلم
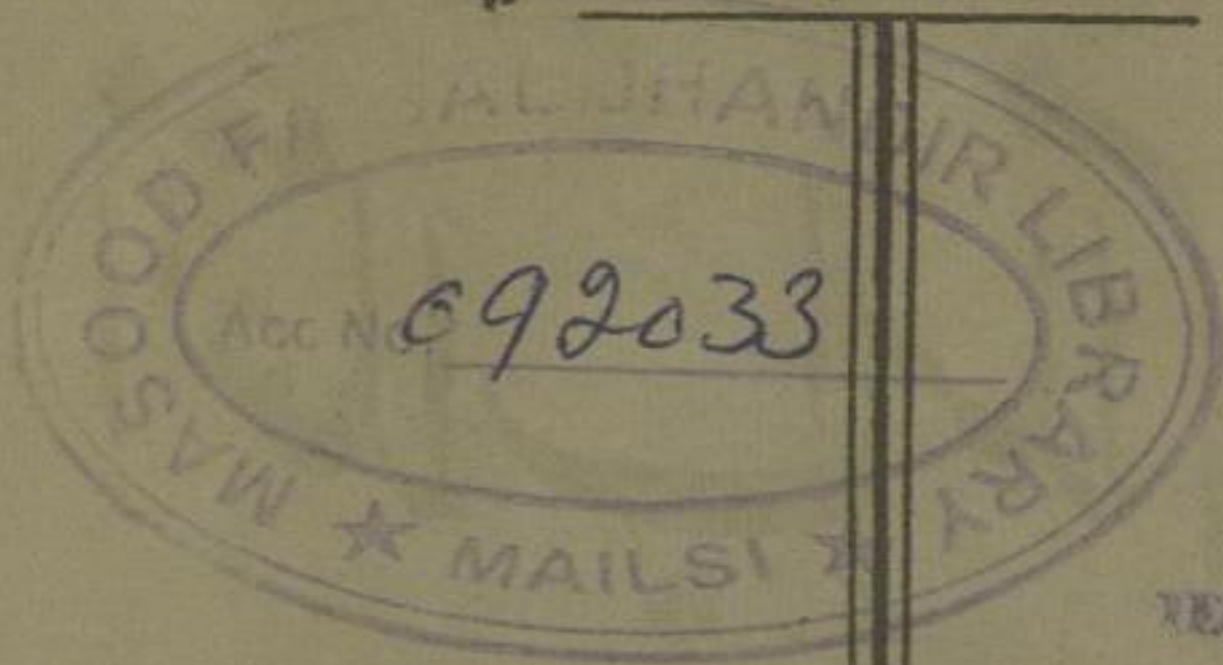
دار البلاغ لاہور

پبلشرز

دار البلاغ

محمد نگر۔ اقبال روڈ

لاہور

قیمت تین روپے ۸ر

بار اول

مسودہ انقلاب اسلام کا ایک ورق

فاضل مولف کا نمونۂ تحریر اور حاشیہ پر حضرت علامہ اقبالؒ کا قلمی نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

اور چین کی بھی یہی خواہش ہے لیکن ہمیں یورپ کے ان متعصب اور تنگ نظر سیاستدانوں کے زاویہ نگاہ سے کچھ سروکار نہیں جنہیں ہر چیز میں "پان اسلام ازم" اور "پان ایشیاٹزم" کا ہوا نظر آتا ہے۔ مقابلۃً ہمارے مد نظر تو وہ عالمگیر اور فیض رساں تحریک ہے جو اسلام اور دیگر مذاہب کے نقطۂ خیال سے اخوت اقوام عالم اور آپس کے ربط و ضبط کے لئے ایک بہت بڑی طاقت متصور ہو رہی ہے۔

اس عالمگیرانہ تحریک کا یورپ میں غازی مصطفیٰ کمال بانی ہے اور ہندوستان میں گاندھی۔ لیکن گاندھی جی کی پالیسی یورپ کے نقطۂ خیال سے برطانوی مفاد کے خلاف ہے اور اسی لئے انگریز اس سے بیزار بھی ہیں لیکن غازی انگورہ اس پالیسی کے باعث یورپ کے سیاستدانوں کی نگاہ میں ایک عظیم انسان متصور ہو رہا ہے حالانکہ دونوں کے مد نظر ایک ہی مقصد ہے یعنی بین الاقوامی مساوات کا شعور پیدا کرنا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دونوں کی راہ الگ الگ ہے۔ گاندھی جی کی تحریک گو حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے تاہم "ینگ انڈیا" میں چند ایک (قابل اعتراض) مضامین شائع کرنے کے لئے حکومت کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور غازی مصطفیٰ کمال کی پالیسی بھی کسی سے دب کر رہنے کی نہیں۔ یعنی غازی موصوف ملکی مفاد

غازی کی بین الاقوامی مساوات تسلیم کرنے کی ... حالانکہ ...

گاندھی جی بین الاقوامی مساوات کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ سی ور داس کا خیال بالکل غلط ہے۔ اور ہندوستان کے سیاسیات ...

بارہ سال بعد

۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں کوہ مری جانے سے پیشتر ایک روز میں استاد مکرّم
حضرت علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں حضرت
علامہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ پاس ہی ایک اور کرسی پر دو تین کتابیں رکھی تھیں حضرت مرحوم
و مغفور نے ان میں سے ایک کتاب "دی پولیٹیکل اینڈ ریلیجس ریولیوشن ان اسلام"
(THE POLITICAL AND RELIGIOUS REVOLUTION
IN ISLAM) مصنفہ فیلکس ویلائی (آسٹرین نو مسلم) اُٹھا کر مجھے دی اور ارشاد
فرمایا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کروں اور اگر ہو سکے تو اسے اُردو میں منتقل کر دوں میں
نے عرض کیا کہ میں تو دو ایک روز میں تبدیل آب و ہوا کیلئے کوہ مری جا رہا ہوں۔
ارشاد فرمایا کہ کتاب ساتھ لے جاؤ۔ کچھ دیر بعد میں اجازت لے کر واپس چلا آیا۔
پہاڑ پر آ کر میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ فیلکس ویلائی کی اس مشہور عالم

کتاب کا یورپ کی اکثر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا تھا۔ میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق اسے اُردو میں منتقل کر دیا۔ کوئی دو اڑھائی مہینے بعد جب میں واپس آیا تو ایک روز حضرت علامہ کی خدمت میں بھی حاضر ہُوا اور کتاب اور ترجمہ پیش کر دیا۔ آپ ترجمہ دیکھ کر ذرا مسکرائے اور فرمایا "بڑی ہمت کا کام کیا" مسودہ آپ نے دیکھنے کو رکھ لیا ؛

چند روز بعد جب میں پھر حاضر ہُوا تو حضرت ممدوح نے مسودہ مجھے واپس عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کہیں دو ایک جگہ نوٹ بھی لکھ دیا گیا ہے اب اسے جلد شائع کروا دو۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ اگر مناسب ہو تو کتاب کے متعلق اپنے دست مبارک سے کچھ لکھ دیں۔ قلم دوات کرسی پر پاس رکھی تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے حضرت علّامہ نے پانچ سات سطریں لکھ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے حضرت علامہ کی تحریر بھی مسودہ میں شامل کر لی ؛

میں لے واپس آکر جب مسودہ دیکھا تو اُستاد مکرم نے بہت سے مقامات پر اپنے قلم سے کچھ اصلاح اور دُرستی بھی فرمائی تھی ؛

اب میں یہ کتاب شائع کرنے کی فکر میں تھا کہ ایک روز ایک صاحب ملنے تشریف لے آئے۔ میں نے جب مسودہ کا ذکر کیا تو اُنہوں نے مسودہ پڑھنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور دو تین روز میں مسودہ واپس کر دینے کا وعدہ کیا۔ میں نام تو نہیں بتلانا چاہتا لیکن آدمی چونکہ بظاہر معقول تھے۔ میں نے مسودہ دے دیا اور وُہ نامعقول آدمی مسودہ لے کر ایسا غائب ہُوا۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کچھ روز بعد میں نے یہ تمام واقعہ حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کر دیا اور آپ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۴ء کا

واقعہ ہے۔ پورے بارہ سال گزر گئے نہ وہ صاحب خود تشریف لائے نہ مجھے مسودہ واپس ملا لیکن ۱۹۴۶ء کے اختتام پر ایک عجیب اتفاق سے مسودہ مجھے مل گیا۔ مسودہ ملنے کی تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی بے حد ہُوا کہ حضرت علامہ کی تحریر غائب تھی۔ آج اتنی مدت کے بعد مجھے اس تحریر میں سے صرف ایک فقرہ یاد ہے۔

"یہ کتاب ہر پڑھے لکھے مسلمان کو پڑھنی - اور اپنے ناخواندہ بھائیوں کو پڑھ کر سُنانی چاہیئے۔"

ان الفاظ کے بعد حضرت علامہ کے دستخط تھے ؛

مسودہ تو مجھے واپس مل گیا لیکن اب زمانے کے حالات اور سے اور ہو چکے تھے۔ اسلیئے میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اکثر دوستوں کا یہی مشورہ تھا کہ اسے شائع کر دیا جائے اور ضمیمہ کے طور پر اسلامیان ہند کے حالات بڑھا دیئے جائیں گو مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ یہ کتاب اُستاد مکرم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی لیکن آج جب میں اسے اہل نظر کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ تو مجھے یہ اطمینان اور خوشی بھی ہے کہ آخر حضرت علامہ خلد آشیاں کے ارشاد کی تعمیل ہو ہی گئی۔ ضمیمہ "اسلامیان ہند پر ایک طائرانہ نظر" کے عنوان سے اس میں شامل ہے پہلے چار باب "یورپ اور ایشیا"۔ "انقلاب ٹرکی"۔ "مصر"۔ اور "روس اور ایشیائے کوچک" اہل نظر کو ایک داستانِ پارینہ معلوم ہونگے کیونکہ جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ زمانے کے حالات بالکل بدل چکے ہیں تاہم مجھے اُمید ہے کہ یورپ

کے عیسائیوں اور مسلمانوں کی چپقلش کی یہ داستان پارینہ بھی ایک داستان عبرت سے کم نہ ہو گی اور پڑھنے والا اس نکتہ کو آسانی سے سمجھ سکے گا کہ مسیحی حکومتیں خصوصیت سے برطانیہ کس کس طریق سے مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈہ کرتی رہی ہیں۔ اس کتاب کے آخری باب "اسلامیان ہند پر ایک طائرانہ نظر" کا ایک ایک ورق انگریزوں کی مسلمانانِ ہندوستان سے ناپاک روش کا آئینہ دار ہے۔ اور واقعات زبان حال سے پکار پکار کر ہر کہہ ومہ کو بتلائینگے کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو آزادی دیتے دیتے بھی سودا بازی سے باز نہیں آئی اور جاتے جاتے بھی مسلمانوں سے جس قدر بے انصافی ہو سکتی تھی کر گزری ؂

"انقلاب اسلام" کے مطالعہ کے بعد اگر مسلمان یہ نکتہ سمجھ لیں کہ ہندوستان میں انگریز اور ہندو روزِ اوّل سے مسلمانوں کی تخریب سے کبھی باز نہیں رہے اور آزادی ملنے کے بعد ہندو کانگریس نے سکھوں ایسی درندہ صفت، جاہل اور ظالم قوم کو اُبھار کر جو شرمناک مظالم مسلمانوں پر کروائے۔ اگر مسلمان یہ خونی واقعات بھول گئے تو ہندوستان میں وہ کبھی عزت اور آبرو سے نہ رہ سکیں گے ؂

ایم اکرم

اُستادِ مکرم حکیمِ ملّت

حضرت علاّمہ شیخ محمدؐ اقبال علیہ الرحمتہ

کی

مبارک رُوح کے نام!

ایم۔ اسلم

فہرس

یُورپ اور ایشیا

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

(علامہ اقبالؒ)

اس وقت اہل یورپ کے پیش نظر محض ذاتی مفاد اور خود غرضانہ اغراض کے سوا کچھ بھی نہیں اور ملک گیری کی یہ مہلک پالیسی جس میں صحیح تدبر اور سیاست سد رمق بھی نہیں پھر ایک بار دنیا کے خرمن امن میں آگ لگاتی نظر آتی ہے۔ اور یہ آگ گو ابھی تو محض ایک چنگاری ہی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ وقت بھی دور نہیں جب یہی چنگاری شعلہ جوالہ بن کر دنیا کو صحیح معنوں میں ماتم خانہ برنا ڈپر بنا دے ؛

اس لئے مناسب ہے کہ ہم بھی ذرا بنظر غور تاریخ عالم کا پھر ایک بار مطالعہ کریں۔ اور ان واقعات اور ناقابل تردید اصولوں پر غور کریں جن پر نیک نیتی سے عمل پیرا ہونا کسی قوم یا ملک کے پُرامن اور شاندار مستقبل کا پیش خیمہ ہوتا ہے ؛

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بساطِ سیاست کے مغربی شاطر ساکنانِ مشرق (یعنی ایشیا اور افریقہ میں بسنے والے کو ذلیل اور رسوا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور خردمندان مغرب کی معاندانہ چالوں کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مغرب اور مشرق کے بسنے والے ایک بار پھر خون کی ہولی کھیلیں۔ ایسی خوفناک ہولی جس سے مشرق اور مغرب کی سرزمین بیگناہوں کے خون سے لالہ زار بن جائے۔ مادہ پرست اہل مغرب خدا اور

مذہب سے منہ موڑ کر ایک ایسے ابلیسی نظام کا جال چاروں طرف پھیلا رہے ہیں جس کے دامن میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کان اب ضمیر کی آواز سُننے کے قابل نہیں رہے حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ یا قومیں ضمیر کی آواز سُن کر اس پر عمل کرتی ہیں ہمیشہ دُنیا میں عزت اور وقار سے رہتی ہیں اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے پس ماندہ اقوام کیلئے مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں:

دُنیا میں آج کل جو ایک خوفناک اقتصادی کساد بازاری اور عام بے اطمینانی کی رَو چل رہی ہے اور اس کے دوش بدوش ایک عالمگیر تباہی کے آثار بھی کھُلے کھُلے نظر آ رہے ہیں۔ چشم بینا حیران ہے کہ انسان نے جو کام صدیوں کی لگاتار محنت اور بھائیوں کا خون بھینٹ چڑھا کر سرانجام دیئے تھے۔ آج وہ خود کیوں ان کی تباہی اور تخریب کے درپے ہو رہا ہے:

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس ذہنی کشمکش اور بے اطمینانی کی وجہ غالباً وہ بے اعتمادی ہی ہے جو مغرب کے سیاستدانوں کی مردم آزار پالیسی سے پھیل رہی ہے یعنی وہ اپنا مطلب حاصل کرنے کیلئے دوسروں کو محض قربانی کا بکرا سمجھتے ہیں اور اسی لئے اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کے آرام اور آسائش کی خاطر تمام بنی نوع انسان کا ⅔ حصہ اقتصادی مفاد کے شوالے پر بھینٹ چڑھا رکھا ہے:

وہی مقدس انجیل جس کے نام پر مخلوق خدا کو "مساوات اور بھائی چارے" کا پیغام دیا جاتا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ اسی کا واسطہ دلا دلا کر زمانہ سلف کے عیسائیوں نے تہذیب اور تمدن کے اس قدیمی گہوارہ یعنی سلطنت روما کا شیرازہ بکھیر دیا اور آج پھر وہی مقدس انجیل غیر مسیحی اقوام کی تباہی اور بیخ کنی کے لئے

دلیل کے طور پہ پیش کی جارہی ہے کون جانے کہ ع
"یہ صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہُوا راہی"

آج سے صرف پچاس سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مذہب نے فرقہ دارانہ تعصب اور "ایشور ودیا" کی بندشوں سے آزاد ہو کر ہمیں یہ تلقین کرنی شروع کی کہ جناب بُدھ اور حضور پیغمبرِ اسلام خدا کی یہ دونوں مقتدر اور مقدس ہستیاں مسیح علیہ السلام کی طرح دُنیا میں صرف ایک خدائے رحمان کی سلطنت قائم کرنے آئی تھیں ⁂
رہے وہ جُزوی اختلافات جن کا ذکر ہم تاریخ عالم میں دیکھتے ہیں تو ایک غیر متعصب اور منصف مزاج آدمی کو ان سے اثر پذیر نہیں ہونا چاہیئے وہ لوگ جو مذہب کی صحیح راہ پر ہو لئے ہیں ان کی وسعت نگاہ ہمارے ان مبلغین اور مذہبی رہنماؤں سے جو آج تک پُرانی لکیر کو پیٹتے چلے آئے ہیں۔ زیادہ وسیع ہونی چاہیئے لیکن وہ بھی آج تک اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکے کہ ع

جو ہو ذوقِ نظر پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

یہ مسیحی مبلغین جناب بُدھا اور حضور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم اور کام کو اسی نگاہ اور اسی احترام سے دیکھتے ہیں جس نگاہ اور احترام سے جناب مسیح کی تعلیم اور کام کو۔ اور جس طرح ہندوستان کے اس "روحانی فلسفہ" کو قابلِ تعظیم سمجھتے ہیں جس کا ہندوؤں کی مذہبی کتب میں ذکر ہے۔ اسی طرح اسلام کی پاکیزگی اور تعلیم کی خوبصورتی کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرتے ہیں اور یہی تقدس اور تکریم ان آسمانی دعاؤں کے پڑھنے کے وقت ظاہر کرتے ہیں جو انجیل میں مذکور ہیں ⁂

ایک طرف تو یہ لوگ خدا کی ساری مخلوق کو اخوت کے ایک رشتہ میں منسلک کرنا چاہتے ہیں لیکن جہاں تک سیاسی اغراض کا تعلق ہے یہی لوگ اہل مغرب اور مشرق کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر اُبھارتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان ناعاقبت اندیش اور خود غرض لوگوں کے مدنظر صرف ذاتی مفاد ہیں اور ان مفاد کی حمایت نہ صرف یہ "مفلوج پریس" ہی کر رہا ہے بلکہ "مشتری حکومت" اور حکمت عملی بھی اس کی موید نظر آتی ہے اسلیئے جب کبھی یورپ اور امریکہ کے سامنے "مشرق" کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو اس وقت ان خود غرض لوگوں کی "پست ذہنیت" اور تعصّب پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہونے لگتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ مسئلہ جو صدیوں سے ان لوگوں کی سیاسی ہوس کا شکار ہو رہا ہے اس کی اخلاقی اور مادّی اہمیّت کو تسلیم کر کے اس کے سُلجھانے کی کوشش کی جائے کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یورپ کے سیاستدان اور مذہبی پیشوا اُسے نئی نئی اُلجھنوں میں ہمیشہ ڈالتے رہتے ہیں اور بھُولے سے بھی وہ راستہ اختیار نہیں کرتے جو دوست اور دُشمن دونوں کو سلامتی کی منزل تک پہنچا دے۔ ان تنگ نظر سیاست دانوں اور متعصّب مذہبی پیشواؤں کے علاوہ کچھ کارخانہ دار بھی ہیں جو دولت کی جلوہ ریزیوں سے اندھے ہو کر اہل مشرق سے انصاف اور رواداری کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی ان غاصبانہ حقوق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں جو کسی نہ کسی طرح انہیں حاصل ہو چکے ہیں ؛

دُور کیوں جایئے ابھی دو سال ہی ہوئے کہ "لنکاشائر" کے کارخانہ داروں نے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کے پاس ان تجاویز کے ردِ عمل کیلئے ایک درخواست پیش کی تھی جو ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی نے اپنے ہاں کے کارخانہ داروں کو غیر ملکی

سرمایہ داروں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کیلئے اختیار کی تھیں۔ در اصل اس غیر منصفانہ اور کورانہ تحریک کا اصل باعث وہی تنگ نظری اور نفس پروری تھی جس سے مجبور ہو کر "لی آنز" (LYONS) کے ریشم کے کارخانہ والوں نے اور قسطنطنیہ کے ایوانِ تجارت نے ترکی کی اقتصادی خوشحالی کے خلاف ایک تحریک جاری کر دی تھی۔

ان سب تحریکوں۔ چالبازیوں اور عیاریوں سے یورپ کا مقصد صرف یہی تھا کہ یورپ سے باہر صنعت و حرفت کے جس قدر کارخانے ہیں اُن کو کبھی متحد ہو کر کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے تاکہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے صنعتی و حرفتی مُلک اس ناجائز فائدہ سے محروم نہ ہو جائیں جو دوسروں کے گلے پر چھری چلا کر وہ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک اس قدر عظیم الشان اخلاقی مسئلہ بھی محض زر پرستی اور سرمایہ داری کے شوالے پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ اور راہ گم کردہ دانایانِ فرنگ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈھ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

لیکن کچھ روز سے مشرق کا مسئلہ ایک ایسی صورت اختیار کر رہا ہے جس سے یورپ اور ایشیا کے تعلقات کو استوار رکھنے کیلئے اب دانایانِ فرنگ کو بھی پہلو بدلنا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ اب ہم ایشیا کے مہذب باشندوں کو غیر مُلکی کارخانہ داروں کی حرص و ہوس کی قربان گاہ پر قربان ہوتے نہیں دیکھ سکتے بلکہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ مختلف اقوام کے سیاسی اور اقتصادی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایشیا والوں کو بھی ان کا حق

دے دیا جائے اور ان کے ساتھ بھی مساوات اور اخوت کا برتاؤ کیا جائے اور یہی وہ چیز ہے جس کا ایشیا والے ایک مدت سے تقاضا کر رہے ہیں اور آج جو ہم اسلام اور ایشیا کی دیگر اقوام کو یورپ کی مخالفت میں ہمخیال اور متفق پاتے ہیں۔اس کی وجہ بھی فرنگی سیاست کی وہی غلط حکمت عملی یعنی ایک کو دوسرے سے جدا رکھنے کی پالیسی ہے جس کی قلعی ایک فرانسیسی تاریخ دان "البرٹ سورل" (ALBERT SOREL) نے انیسویں صدی میں خوب اچھی طرح کھول دی تھی۔

دنیا اس وقت جن مصائب میں مبتلا ہے۔اس کی وجہ ایک زبردست قوم کی وہی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور کمزور کو ہمیشہ کمزور رکھنے کی ناپاک پالیسی ہے۔اگر یہ مان لیا جائے کہ ابتدائے آفرینش میں ایک قوم دوسری قوم کے زرخیز مقبوضات پر قبضہ کرنے کے لئے ہمیشہ برسرپیکار رہی ہے۔اس لئے آج بھی دنیا کی نعمتوں کو اقوام عالم میں مساوی طور پر تقسیم کرنے کے لئے کیوں جدوجہد نہ کی جائے کیونکہ اگر ملکوں اور سلطنتوں میں مساوات پیدا کرنی ہے تو بین الاقوامی معاملات میں سیاسی اور اقتصادی مساوات کا ہونا بھی ازبسکہ ضروری ہے۔تواریخی تاثرات جو آج تمام دنیا میں ایک ہیجان سا پیدا کر رہے ہیں۔ایک چشم بینا خوب جانتی ہے کہ یہی تاثرات کس خوفناک طریق سے موجودہ تغیرات کے ذمہ دار ہو رہے ہیں۔

روس۔جرمنی اور آسٹریا ہنگری کی حکومتیں اس استبداد اور بیگانگی کی پالیسی کا شکار ہو گئیں جو انہوں نے دیگر اقوام کیلئے روا رکھی۔یورپ اور ایشیا کے اختلاف کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو واقعات کو رنگ آمیزی سے بدل رہے ہیں حالانکہ

ایک ایسا شخص جسے تاریخ عالم پر تھوڑا سا بھی عبور ہو خوب سمجھ سکتا ہے کہ مشرق کا موجودہ رجحان مغرب کی ان تدبیروں کو ایک دن ٹھکرا دے گا جو یورپ کی سپید چمڑی والی اقوام ذاتی مفاد کے لئے اہلِ مشرق کے خلاف صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں ؂

اس وقت صرف دیکھنا یہ ہے کہ ایشیا جس مساوات کا آج مطالبہ کر رہا ہے آیا ہمارا بھی یہ فرض ہے یا نہیں کہ ہم اپنے ایشیائی ہمسایوں کے ساتھ اخوت کا سلسلہ قائم کر کے انہیں اپنے کنبہ میں شامل کر لیں اور جہاں تک اقتصادی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ان سے تعاون کریں۔ اہلِ جاپان کا یہ حق جو ہم نے کسی وجہ سے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ اس راستے کی طرف ہمارا پہلا قدم ہے اور غیر مسیحی اقوام کے متعلق جو ہم نے ایک مدت سے معاندانہ حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ قدم اٹھانے کے بعد ہمیں اس میں مناسب اور منصفانہ ترمیم کی ضرورت محسوس ہو ؂

"تاجدارانِ اسلام بھی جو ایسے لوگوں اور ایسی اقوام کی تسخیر کی کوشش میں جو تقریباً نصف ایشیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں مدتوں لگے رہے لیکن اب ان کی پالیسی میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے چنانچہ جب نومبر ۱۹۲۱ء کے اینگلو افغان معاہدہ کے بعد امیر افغانستان نے پہلے برطانوی سفیر کو کابل میں شرف باریابی عطا فرمایا تو مسلم اقوام کی بیچارگی کا جو غیر مسلم حکمرانوں کی حرص و آز کا شکار ہو رہی ہیں خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ اہلِ اسلام کی بھی یہی خواہش ہے کہ موجودہ تہذیب کے دوش بدوش قدم اٹھائیں اور افغان بھی دل سے اس بات کے متمنی ہیں کہ حکومت برطانیہ سے ان کے تعلقات دوستانہ ہو جائیں ؂

غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ایشیائے کوچک کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے
اہل یورپ سے اسی مساوات کی پالیسی پر عمل کیا اور اس وقت ہندوستان اور چین
کی بھی یہی خواہش ہے لیکن ہمیں یورپ کے ان متعصب اور تنگ نظر سیاستدانوں کے
زاویہ نگاہ سے کچھ سروکار نہیں جنہیں ہر چیز میں "پان اسلام ازم" اور "پان بغداد ازم" کا
ہوّا نظر آتا ہے بلکہ ہمارے مدنظر تو وہ عالمگیر اور فیض رساں تحریک ہے جو اسلام
اور دیگر مذاہب کے نقطہ خیال سے اخوت اقوام عالم اور آپس کے ربط وضبط
کے لئے ایک بہت بڑی طاقت متصور ہو رہی ہے ؛

اِس مآل اندیشانہ تحریک کا یورپ میں غازی مصطفےٰ کمال بانی ہے اور ہندوستان
میں گاندھی لیکن گاندھی[1] کی پالیسی یورپ کے نقطہ خیال سے برطانوی مفاد کے خلاف
ہے اور اس لئے اہل مغرب اس سے بیزار بھی ہیں لیکن فاتح انگورہ اسی پالیسی کے
باعث یورپ کے سیاستدانوں کی نگاہ میں ایک عظیم الشان ہستی متصوّر ہو رہا ہے حالانکہ
دونوں کے مدنظر ایک ہی مقصد ہے یعنی بین الاقوامی مساوات کا شعور پیدا کرنا۔ ہاں
اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دونوں کی راہ الگ الگ ہے۔
گاندھی یوں تو تشدد کی پالیسی کے خلاف ہے تاہم ینگ انڈیا میں چند ایک (قابل
اعتراض) مضامین شائع کرنے کیلئے حکومت کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ادھر غازی
مصطفےٰ کمال کی پالیسی بھی کسی سے دب کر رہنے کی نہیں یعنی غازی موصوف ملکی مفاد

---

[1] گاندھی بین الاقوامی مساوات کا حامی نہیں فیلکس ویلائی کا خیال بالکل غلط ہے اور ہندوستان
کے سیاسیات سے اس کی بیخبری کی دلیل - حضرت علامہ اقبال مرحوم

کی خاطر تشدد کرنا بھی جائز اور ایک مُلکی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اس پر ان کی قوم اور
مُلک کو ان پر پُورا پُورا اعتماد ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ چون و چرا کرے۔ غازی
مصطفےٰ کمال نے اپنی قوم کی سپاہیانہ معاشرت کے بل پر یورپ سے ترکی کی خود مختاری
تسلیم کروالی اور یورپ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے مُلک کی عظمت کیلئے اہل یورپ سے
سینہ سپر ہو گئے اور ایک دُنیا ہے جو انہیں حق بجانب اور راستی پر سمجھتی ہے لیکن گاندھی
جس نے جنگ عظیم کے موقع پر حکومت برطانیہ سے تعاون کرتے ہوئے ۱۹۱۵ء میں
ہندوستانی افواج کو ترکوں کے مقابل کھڑا کر دیا محض چند قابل اعتراض مضامین لکھنے
کی بنا پر ایک معمولی آدمی کی طرح جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ یہ اس بات کی کھُلی دلیل ہے
کہ اہل یورپ کے دل میں ایشیا والوں کے خلاف کوئی کاوش کارفرما ضرور ہے اور
یہی وہ کاوش یا تنگ ظرفی ہے جو دلوں میں نفرت کا بیج بو رہی ہے ؎

ایشیا اور یورپ کے تعلقات کے متعلق جو ہم نے ایک خیرسگالی کی پالیسی کی
توقع لگا رکھی ہے۔ غلط ہے کیونکہ اس کی وجہ وہ مذہبی جنون اور معاشرتی تعصّب
ہے جو ایک مُدّت سے دونوں براعظم والوں کے دلوں میں پھیلا ہُوا ہے اور اس
بین الاقوامی تعلقات کی کشیدگی کا بھی یہی تعصّب ذمہ دار ہے ؎

دو سال ہوئے جب ولی عہد جاپان بادشاہ انگلستان کی ملاقات کو لنڈن
آیا تو شاہی خاندان اور حکومت برطانیہ نے اس کی بہت آؤ بھگت کی لیکن اسی لنڈن
میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے محض اس وجہ سے ایک مشہور ہوٹل سے جہاں وہ عموماً
قیام کیا کرتے تھے۔ اپنا بوریا بستر اٹھا لیا کہ اس ہوٹل میں جاپانی جنگی بیڑے

کا وہ کپتان اور اس کے افسر بھی فروکش ہوئے تھے جو مشرق کی ایک طاقتور سلطنت کے وارث تخت و تاج کے ساتھ انگلستان آئے تھے اور حکومت کے مہمان بھی تھے۔ ان قدامت پسند انگریزوں کو یہ خوف تھا مبادا انہیں ان "مشرقیوں" کے ساتھ کہیں ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا نہ کھانا پڑے۔ یہ ہے وہ تعصب اور کورباطنی اور تنگ ظرفی جو پیروان مسیح علیہ السلام کو مہاتما بدھ کے پیرؤں سے ہمیشہ جدا رکھتی چلی آئی ہے اور جو نقصان یورپ کی ساکھ کو اس غیر مآل اندیشانہ روش سے ایشیا میں پہنچا ہے وہ اس تمام "اقتصادی تنگ نظری" سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس کے بل بوتے یورپ ایشیا والوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں دبوچے بیٹھا ہے اور یہی وہ اخلاقی مسئلہ ہے جو ایک مدت سے ایشیا اور اہل یورپ کے تعلقات میں کبھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہونے دیتا ؏

آج ہندوستان اور خصوصیت سے عالمِ اسلام میں جو سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کی تہ میں بھی وہی رنگ و بُو کا اختلاف مضمر ہے گو اہلِ مشرق نے یورپ کے ہر ایسے آدمی کی طرف جسے ان سے کچھ بھی سیاسی ہمدردی رہی ہے ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور باوجودیکہ ایشیا والوں کے دل اہل مغرب کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہوئے (جس کی وجہ معاندانہ چالیں ہیں) تاہم ہندوستانیوں نے اور بالخصوص مسلمانوں نے ہمیشہ ان لوگوں پر اعتماد کیا ہے جنہوں نے ان کے جذبات اور احساسات کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں اہلِ مصر کا جو وفد یورپ آیا تھا تو اُس نے سب سے پہلے انگلستان کے ایک نامور قانون داں سے محض "قانون اقوام" کے متعلق ہی مشورہ کیا تھا تاکہ وہ اس مسئلہ کو دانایانِ فرنگ کے سامنے خوش اسلوبی سے پیش کر سکیں ؏

اسی طرح حکومت انگورہ ہمیشہ ان غیر ملکیوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہی ہے۔ جنہوں نے قولاً یا فعلاً سلطنت ترکی سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے ؞

گاندھی نے بھی انگلستان میں قانون کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا اور ہندوستان میں وہ ایک کامیاب بیرسٹر متصور ہوتا تھا لیکن کچھ مدت بعد اُس نے "ملک یا "قوم" کی فلاح و بہبود کی خاطر وکالت چھوڑ دی[1]۔ اسی طرح مولانا محمد علی (مرحوم) اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو محض "حبِ وطن" کے جرم میں کئی بار جیل جانا پڑا حالانکہ مولانا محمد علی نے بھی انگلستان میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور یورپ سے بھی کسی مناسب موقع پر انہوں نے ملاقات کی۔ وہ اور تبادلہ خیالات کیا۔ اسی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی کے کارکنوں سے بھی (جہاں مولانا نے تعلیم پائی تھی) ہندوستان کیلئے تعاون اور ہمدردی حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے ہندوستان کے نام پر اور "ہندوستانیوں" کے حقوق کی حفاظت کیلئے یورپ کی دوسری درسگاہوں سے بھی اپیل کی گو مولانا کا اس مقصد

[1] کوئی اہلِ نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مہاتما گاندھی بھی ایک بہت بڑے محبِّ وطن اور محبِّ قوم بزرگ تھے۔ لیکن جہاں تک قومیت کا سوال ہے گاندھی جی نے قومی جذبے کے ماتحت ہندوؤں کو اس قدر اُبھارا کہ وہ ایک سرکش گھوڑے کی طرح اصل راستہ سے بھٹک گئے اور گاندھی جی کی یہی پالیسی دو قوموں کے نظریہ کی محرک ہوئی۔ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد گاندھی جی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ چنانچہ قوم کو پھر ایک بار اعتدال پر لانے کی کوشش میں وہ اپنی ہی قوم کے ہاتھوں اسی تشدّد کا شکار ہو گئے۔ جس تشدّد کے خلاف وہ عمر بھر آواز بلند کرتے رہے۔ سی۔ آر۔ داس آنجہانی کا جن دنوں ہندوستان میں طوطی بولتا تھا۔ گاندھی جی کی اسی غلط پالیسی کے باعث کوئی ان کی بات پر کان دھرنے کو آمادہ نظر نہ آتا تھا ؞

میں کامیابی تو نہ ہوئی لیکن کیا ان سب محبانِ وطن کو جو ملک کی بہتری اور برتری کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینا فخر سمجھتے ہیں مجرم قرار دے کر جیلوں میں ٹھونس دینا بھی کہیں کا انصاف ہے ؟ ان ہمدردانِ قوم کو مجرم سمجھنے والے خود مجرم ہیں ؛

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی دفتری حکومت ابھی تک مسلمانوں اور ایشیا والوں کے احساسات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی یا ہو سکتا ہے کہ ان کے احساسات سمجھنے کی حکومت ہندوستان میں صلاحیت ہی نہیں۔ مشہور مصنف "اینا ٹول فرانس" (ANATOLE FRANCE) نے اپنی ایک کتاب "ETUI DE NACRE" کے اس حصّے میں جہاں وہ جیوڈیا کے گورنر[1] کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح اس نے ایک "مصلحِ قوم" اور انقلاب پسند کو جس کے عقائد سے وہ ذاتی طور پر واقف تھا محض اہلِ روما کی خاطر سولی دلوا دی تھی اگر ہم اس کا "لارڈ ریڈنگ" سابق وائسرائے ہندوستان کی پالیسی سے مقابلہ کریں تو دونوں میں ایک نمایاں مناسبت نظر آتی ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے جو ایک یہودی نژاد وائسرائے تھا ہندوستان کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ ہندوستان کے اہل الرائے رہنماؤں کے مشوروں پر ہمدردانہ غور کریگا۔ اور لوگوں کو یہ باور کرانے کو کہ "اینگلو سیکسن" اقوام ان لوگوں سے جو ان سے عہدِ وفا باندھتے

---

[1] نوٹ :- مسیح علیہ السلام کی سولی کی طرف اشارہ ہے۔ پائلٹ جو جیوڈیا (ملک شام) میں گورنر تھا گو جناب مسیح کو اور ان کی تعلیم کو ملک اور ملّت کے لئے مفید سمجھتا تھا۔ تاہم اس نے اہلِ روما کے کہنے سننے سے اُنہیں سُولی دلوا دی ؛

ہیں انصاف کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتیں اپنی تقریروں میں اپنی قوم (اہل یہود) اور انگریزوں کے خوشگوار تعلقات کا بھی ذکر کر دیا ؛

چنانچہ ہندوستان میں آنے کے چند روز بعد لارڈ موصوف نے گاندھی کو شملہ آنے کی دعوت دی اور پانچ چھ ملاقاتوں میں جو وائسرائے اور گاندھی کے درمیان ہوئیں کچھ ایسی خوشگوار توقعات ہونے لگیں جن کی اس سے پیشتر ایشیا کے رہنے والے اُمید بھی نہ کر سکتے تھے لیکن جب اس کے چند روز بعد ہی گاندھی غریب کو جیل جانا پڑا تو ہمارے تعجب کی کچھ انتہا نہ رہی اور لوگ حیران تھے کہ لارڈ ریڈنگ جیسا مدبّر اور سیاستدان جو انگلستان کا ایک مشہور قانون دان بھی ہے اور کسی زمانے میں انگلستان کا چیف جج بھی رہ چکا ہے اس عقدہ کو سلجھانے میں کیسے ناکامیاب رہا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ اس اختلاف کا باعث کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ تھا بلکہ ایک طرف وہی ہندوستان کی دفتری حکومت کی آمرانہ ذہنیت تھی جس سے وائسرائے ابھی اچھی طرح واقف نہ تھا اور دوسری جانب گاندھی کا مذہبی تعصّب اور سیاست سے بیخبری تھی (شاید تنگ نظری بھی ہو) جس نے دونوں کو کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے دیا اور واقعی اہلِ انگلستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ ابھی تک اس گرکو نہیں سمجھ سکے جس سے سلطنت برطانیہ کو استحکام حاصل ہے۔ دو صدیوں کی لگاتار تگ و دو کے بعد جب برطانیہ نے اپنے بیرونی مقبوضات کی وجہ سے ایک عظیم الشان شہرت حاصل کر لی ہے اور دنیا اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں ایک دوسرے سے مساوات اور خیرسگالی کے تعلقات رکھنا ناگزیر ہے تو یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یہی سلطنت برطانیہ ایشیا والوں سے ابھی تک تعاون کرنے سے پہلوتہی کر رہی ہے

حالانکہ ایشیا ہی وہ برِ اعظم ہے جو اقوامِ عالم کی شہرت کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ اور آج برطانیہ کی شہرت بھی اسی ایشیا ہی کی منت پذیر ہے اور شاید اقوامِ عالم کی آنے والی عظمت کا سہرا بھی اس کے ہی سر رہے تو کوئی تعجب نہیں ؛

سلطنت برطانیہ اور یورپ کا ستارہ آج کل جس نحوست میں پھنسا ہوا ہے اس کی اصل وجہ بھی دانایانِ فرنگ اور یورپ کے سیاستدانوں کی ناپختہ کاری ہے اسی طرح بنی نوع انسان جس لعنت میں گرفتار ہیں اس کی وجہ وہی "گلیڈسٹونی"[1] ذہنیت ہے جو مسیحی دُنیا میں کنٹربری سے لے کر ایتھنز تک پھیلی ہوئی ہے جس طرح ایک ڈاکٹر کا یہ فرض ہے کہ اگر کسی چیز کو وہ اپنے مریض کی زندگی یا صحت کیلئے خطرناک سمجھے تو اسے فوراً اس سے خبردار کردے۔ اسی طرح ہم بھی اہلِ یورپ کو یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس تمام نحوست اور وبال کا باعث وہی اخلاقی کمزوری ہے جس سے ان کے دل بھی اب کچھ کچھ متاثر ہو رہے ہیں ؛

ادھر مغربی دُنیا کی کور باطنی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سرزمین جو ایک زمانہ تک اس کیلئے فلسفہ۔ مذہب اور سامان زیست کا منبع تھی آج اس سرزمین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ یورپ کے چند اہلِ بینش کے سوا باقی سب لوگ وہی پُرانی لکیر پیٹتے چلے آتے ہیں۔ اور ایشیا اور اسلام کے متعلق اور ساتھ ہی اس ایشیائی تہذیب

---

[1] گلیڈسٹون سلطنت برطانیہ کا وزیرِ اعظم تھا۔ مسلمانوں کا بالعموم سخت مخالف۔ اور ترکوں کو یورپ سے نکالنے کی ہر وقت کوشش میں لگا رہتا تھا ؛

کے متعلق بھی جس کا کسی زمانے میں ایک عالم میں ڈنکا بج رہا تھا۔ ان کا یقین اور ایمان صرف بے سروپا توابہجی ڈھکوسلوں پر رہ گیا ہے جن کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ حقیقت۔ پھر ان لوگوں پر ہی کچھ موقوف نہیں بلکہ مغرب کی بڑی بڑی درس گاہیں بھی ایشیا کی قدیم اور شان دار روایات کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمائیے۔ ہم ان لوگوں سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں جن کے ہاتھ میں بدقسمتی سے ایشیا والوں کی قسمت کی باگ ڈور ہے یا زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں مشرق کے ساکنوں کو ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ذاتی مفاد اور اقتصادی منافع بازی کے قعر مذلت میں کچھ ایسے گرے ہوئے ہیں کہ اگر چاہیں بھی تو بھی غریب ایشیا والوں کے متعلق کسی بلند خیالی یا عالی حوصلگی کا ثبوت دے ہی نہیں سکتے اور نہ ہی ان کی خیر سگالی کی خواہش اور فراخدلی کا جذبہ انہیں کسی طرح متاثر کر سکتا ہے ؀

اقتصادی اور مالی منافع بازی کے نقطۂ نظر کے علاوہ ایک رُوحانی اور اخلاقی تعلقات کا مسئلہ بھی ہے اور یہ وہ مسئلہ ہے جس سے مختلف اقوام کے دلوں میں بین الاقوامی برادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ لوگ جن کے دل مذہبی تعصّب سے پاک ہیں۔ انہیں دونوں براعظموں میں اخوت اور مساوات کے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور آج دُنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو دل سے دونوں براعظموں کے رہنے والوں میں ایک اخلاقی اور روحانی تعلق دیکھنے کے خواہشمند ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو مغربی سیاست سے بھی واقف ہیں اور ان کے دلوں میں بنی نوع انسان کی محبت اور درد بھی ہے۔ وہ محبت اور درد جس میں مذہبی

تعصّب کا شائبہ تک نہیں رہا اور انہیں کم وبیش مشرقی معاملات سے بھی کچھ آگاہی ہے یقیناً ایسے لوگ اس مقدس کام کو انجام تک پہنچانے میں بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ان کی کوشش سے یہ نسلی امتیاز آسانی سے مٹ سکتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے یہ محسن اگر اس کام کیلئے کمر ہمت باندھ لیں تو دُنیا کی ۲/۳ حصہ آبادی کی فلاح اور خوشحالی کے لئے یورپ کے خود پسندوں کو آسانی سے مجبور کر سکتے ہیں۔ اور خدا کی خدائی میں ایک عالمگیر اخوت کا رشتہ بہت کم عرصہ میں پھیل سکتا ہے ؂

اگر آج اہل مغرب نے ان خون کے پیاسے مغربی سرمایہ داروں کے خلاف اخلاقی جہاد شروع نہ کر دیا تو پھر یہ تمام سلطنتیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن کی بنیادیں ابھی سے متزلزل ہو رہی ہیں۔ ایک عالمگیر تباہی سے محفوظ نہ رہ سکیں گی اور ایک نہ ایک روز ہمیں پھر وُہی روز بد دیکھنا پڑے گا جو گذشتہ خونریزیوں کی یاد تازہ کر دیگا اور بھائی بھائی کے خون سے ہولی کھیلنے پر آمادہ ہو جائیگا اور ایک باوقار زندگی کے لئے خوفناک سے خوفناک قربانی کرنے کو تیار ہو جائے گا ؂

مسٹر والٹر ممبر پارلیمنٹ نے انگلستان کے مشہور اخبار انیسویں صدی (NINETEENTH CENTURY) میں ایک مضمون شائع کرایا تھا جس کا ایک پُر لطف فقرہ یہ بھی تھا :-

"۱۹۱۸ء کے موسم خزاں میں فوجی نقطۂ خیال سے تو واقعی کوئی شخص اہلِ مغرب کے مقابلہ پر نہیں آسکتا تھا لیکن جہاں تک تدبّر کا سوال ہے اہلِ مغرب کا دیوالہ بھی نکل چکا تھا" ؂

دوسرے الفاظ میں اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اس نئی تحریک یا تدبر کا جس میں خالص قومی اور ملکی مفاد مضمر ہو اور جسے برّاعظم ایشیا اپنے لئے خطرناک محسوس کر رہا ہے وحشیانہ قوت سے قلع قمع کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں پرانے اصولوں کو چھوڑ کر نئے مصلحت آمیز اصولوں پر کاربند ہو کر یورپ اور ایشیا کے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے ؛

اسی طرح "لارڈ رانلڈ شے" نے جو کسی وقت بنگال کے گورنر تھے ہندوستان کے لئے ایک نیا اقتصادی پروگرام پیش کرتے ہوئے اسی اخبار میں اس خطرہ کو بھی تسلیم کیا تھا جو خطرہ گاندھی اور داس نے اپنے ملک کی صنعت وحرفت کے لئے محسوس کرتے ہوئے مغربی کارخانہ داروں کی مخالفت شروع کی تھی لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ یہی گاندھی جو یورپ کی بنی ہوئی ہر چیز سے متنفر نظر آتا ہے اسی ریلوے کے استعمال سے کبھی بیزاری کا اظہار نہیں کرتا جو انگلستان کے کارخانوں میں تیار ہو کر ہندوستان کے طول و عرض میں چل رہی ہیں اور اسی طرح داس بھی اکثر اسی "کار" میں بیٹھا ہوا اپنے ہموطنوں کے ہجوم میں نظر آیا کرتا ہے جو غیر ملکی کارخانوں میں بن کر ہندوستان میں لائی گئی ہے۔ سچ ہے ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اہلِ مشرق نے کبھی ذہنی تنگ نظری کا آج تک اظہار نہیں کیا اور مشرقی ممالک کے نونہال سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مغربی

درسگاہوں میں تعلیم اور تربیت شوق سے پاتے ہیں انہیں اگر نفرت ہے یا شکایت ہے تو مغرب کے ان سرمایہ داروں سے ہے جو اخوت۔ برادری اور مساوات کے تمام پہلو نظر انداز کر کے جونک کی طرح دوسروں کا خون چوسنا ہی شرافت اور اخوت سمجھتے ہیں اور دوستی اور محبّت پیدا کرنے کی بجائے بڑی خوشی سے سونے اور چاندی کا جوتہ مُنہ پر کھا لیتے ہیں۔ اہلِ مغرب کی یہی وہ سفلانہ اور ناپاک ذہنیت ہے جس نے مشرق کو آج تک مغرب کے نزدیک نہیں آنے دیا ؛

اِنقلابِ ترکی

اور

اِسلام کا مستقبل
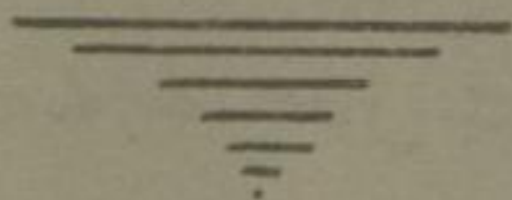
ہے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار

جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

(علامہ اقبالؒ)

(۱)

رسولِ عربی صلعم کا ارشاد ہے کہ جو عقل اور حکمت سے کام لے اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو کورِ باطن ہو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے ؛

ایک مدت سے بلادِ مشرق کے رہنے والے راؤنڈ ٹیبل آف نیشنز (اقوام کی گول میز) میں جگہ حاصل کرنے کے لئے خداوندانِ فرنگ کے دروازے پر ایک مدت سے دستک دے رہے ہیں اور مشرق کے مسلمان خصوصیت سے اپنی خدمات بنی نوع انسان کے نام پر بین الاقوامی مسائل اور تجاویز کے حل وعقد میں شامل کئے جانے کی کوشش کر رہے ہیں مشرق اور مغرب کی رقابت جس کی تاریخ عالم شاہد ہے اب ایک خوفناک صورت اختیار کر رہی ہے اور جب سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ موجودہ "ڈیموکریسی" (حکومت جمہوری) اس مسئلہ کو سلجھا نہیں سکتی۔ دُنیا کی فضا اور بھی تاریک نظر آنے لگی ہے؛ مشہور فلاسفر "نٹ شے" (NIETZSCHE) نے اپنی کتاب (BEYOND GOOD AND EVIL) میں نہایت کھلے اور کسی قدر تلخ الفاظ میں اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے کہ یورپ جو حقیقت میں براعظم ایشیا کا ہی ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے

محض اس لئے ڈینگ مار رہا ہے کہ اس نے سائنس کے میدان میں صنعتی ترقی بہت زیادہ کر لی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہی اہل یورپ ایشیا والوں کی بلند خیالی اور علو ہمت سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں اور اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ یہی وہ ایشیا ہے جہاں دُنیا کے مذاہب نے فروغ پایا ہے اور فلسفہ پروان چڑھا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یورپ کی اخلاقی اور تمدنی ترقی کا موجب و بانی بھی رہ چکا ہے۔

..یورپ کی اقتصادی اور مادی ترقی بلاشُبہ اب دُوسرے ملکوں کیلئے ایک مصیبت بن چکی ہے اور انہیں نانِ جویں کو محتاج کر رکھا ہے لیکن دوسری طرف بنی نوع انسان کے اخلاقی اور روحانی مسئلہ نے بھی ایسے گندم نما جو فروش لوگوں کا قافیہ تنگ کر دیا ہے جو محض مادیات اور اقتصادیات کے دیوتا کے بل بوتے دوسروں کو ہضم کرنا چاہتے ہیں اور بڑی دیدہ دلیری سے اہلِ ایشیا کے جائز مطالبات اور حقوق کو نظر انداز کئے چلے جا رہے ہیں اور چونکہ اہلِ ایشیا صنعت و حرفت کے میدان میں دوسروں کا مقابلہ نہیں کر سکے اس لئے انہیں سرے سے ہی غیر مہذب سمجھتے ہیں لیکن کچھ روز سے اہلِ یورپ کی آنکھوں سے بھی بین الاقوامی تجارت کے مفاد کا خوبصورت پردہ اُٹھنے لگا ہے اور وہ مجرمانہ خود غرضی جو وہ ایک مُدت سے (ایشیا کے متعلق) جائز سمجھتے چلے آئے ہیں اب انہیں فکر مند کر رہی ہے وہ مسئلہ جو ابتدا میں یورپ کی مادی حرص و ہوس سے پیدا ہوا تھا اور جسے کلیسا والوں کی لسانی اور چرب زبانی نے مذہبی رنگ دے رکھا تھا جنگ یورپ کے بعد وہ ایک "اخلاقی اور رُوحانی" صورت اختیار کر چکا ہے اور اب یہ ضرورت سختی کے ساتھ محسوس ہونے لگی ہے کہ تمام اقوام عالم کی شیرازہ بندی کر کے دُنیا کا توازن برابر کر

دیا جائے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پرانے نظریہ کی اس غیر معمولی تبدیلی کی تہ میں صرف اسلام کی عظیم الشان طاقت جلوہ فرما ہے اور اگر کوئی واقعی یورپ اور ایشیا کے اتحاد کا دل سے آرزو مند ہو تو اسے سب سے پہلے اس طاقت کی طرف متوجہ ہونا ہو گا اس کی مثال سلطنت ترکی کا موجودہ نظام ہے جس نے ملک اور ملت کی ہیئت ہی بدل ڈالی ہے اور یہ تبدیلی دانایان فرنگ کیلئے ان لوگوں کی قومی یا ملکی تحریک کے مقابلہ میں جو ایشیائے کوچک میں نمودار ہو رہی ہے۔ زیادہ جاذب توجہ ہو رہی ہے ؛

اپنے مالی مفاد کے پیش نظر دولت خداداد عثمانیہ کے متعلق سلاطین یورپ کی حکمت عملی (پالیسی)، ابھی تک وہی پرانی لکیر کو پیٹنا ہے۔ یہ لوگ حقیقت کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہیں اور اُن اہم مسائل کو جو آج تیزی سے منصۂ شہود پر جلوہ ریز ہو رہے ہیں۔ یورپ کے کسی سیاستدان نے سلجھانے یا سمجھنے کی صرف کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس سے مجرمانہ غفلت کا اظہار کیا ہے تکلف برطرف۔ ذرا ان تجارتی۔ اقتصادی اور دفتری حکومت کی رسمی شکایات پر نگاہ ڈالئے جو "لوزان" کی کانفرنس کے موقع پر یورپ کے نمائندوں نے ترکوں کے خلاف پیش کی تھیں۔ ان شکایات کی تہ میں صرف مذہبی تعصب کارفرما تھا ترک چونکہ مسلمان ہیں اسلئے ان کا کوئی کام نقص سے پاک نہیں۔ اسی طرح قسطنطنیہ کے فرانسیسی ایوان تجارت کی اس درخواست پر بھی غور کیجئے جو اس نے اقتصادی مراعات کے بارے میں پیش کی تھی اور کلیسائی رہنماؤں کی ان گرما گرم تقریروں کو بھی فراموش نہ کیجئے جن کا لب لباب صرف یہ تھا کہ مشرق کی سرزمین کلیسا کی تعلیم کے لئے بہت خطرناک ہو رہی ہے اور یہ بھی نہ بھولئے کہ یورپ اور امریکہ کے عیسائی مبلغ غیر عیسائیوں کے متعلق

کیسا کیسا ناپاک پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اور کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے اسلام کا اثر زائل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں لیکن ایک اہل نظر کیلئے غور کرنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ یہ تحریک یا حکمت عملی جو کچھ بھی ہے۔ سراسر اسلام اور ایشیا کی مخالفت پر مبنی تو ہے لیکن اس میں اصلیت ہے بھی یا نہیں؟ یا محض بغض علیؓ اور حُب معاویہ ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے جو خطرہ ہمیں آج اپنے مالی مفاد اور مراعات کیلئے نظر آرہا ہے اس سے ذرا الگ ہو کر مشرق میں ترکی اور خصوصیت سے عالم اسلام کے عام مسئلہ نے جو صورت اختیار کرلی ہے اس کے سلجھانے کی طرف متوجہ ہوں ہمیں یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ دُنیا کی نجات کا راز صرف اسلام کے اصولوں کی پیروی اور ایشیا سے مساوات کا رشتہ استوار رکھنے میں ہے کیونکہ اسلام ہی وہ عظیم الشان طاقت ہے جس کے ظہور نے زمانہ ماضی میں ایک قسم کا بین الاقوامی "رشک" یا "تخالف" پیدا کر دیا ہے اور اس کا واحد علاج اس وقت صرف یہ ہے کہ "اسلام" کی آواز پہ لبیک کہا جائے اور اس کے "حق اور انصاف" کے مطالبہ پہ ہمدردانہ پہلو سے غور کیا جائے ؂

اسلام یا اسلام کے اصولوں میں جو خوبیاں ہیں ان سے بہرہ اندوز ہونے کیلئے ہمیں سب سے پہلے مسلمانوں کی دوستی اور اعتماد حاصل کرنا ہے لیکن یہ اعتماد یا دوستی کسی حکمت عملی کی منت پذیر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کیلئے ہمیں اہلِ مشرق سے مساوات اور انصاف کا پہلو اختیار کرنا پڑیگا اور انہیں اپنی ہمدردیوں کا عملی یقین دلانا ہو گا ؂

ایشیائے کوچک میں جس تحریک نے اس قدر انقلاب پیدا کر دیا ہے یورپ والے ابھی تک اس نکتہ سے بیخبر ہیں حالانکہ یہی وہ تحریک ہے جو نہ صرف سلطنت ترکی کی کایا پلٹ سکتی ہے بلکہ اس کے بیرونی مقبوضات پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑ سکتا ہے۔

آج کل عالم اسلام کی تو بقول حضرت اقبال یہ کیفیت ہے کہ ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

(۲)

مغربی یورپ عالم اسلام اور براعظم ایشیا کے مستقبل کا مسئلہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جس پہ ایک دُنیا کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اسی لئے ہم اسے ایک بنیادی مسئلہ قرار دے سکتے ہیں۔ باسفورس سے گنگا تک۔ باکو سے ہرات تک۔ انقرہ سے کابل تک اور اسی طرح شملہ۔ کلکتہ اور بمبئی ان سب مقامات میں یہی ایک مسئلہ اہل دانش کی توجہ کا مرکز بن رہا ہے اور ہر ایک جگہ اب یہی سوال پیدا ہو رہا ہے کہ کیا یورپ اور ایشیا اور مشرق اور مغرب مہذب دُنیا کی تقسیم کے مسئلہ پر کبھی متحد ہو سکینگے یا یورپ کو بلند خیال اور بلند حوصلہ ماہران سیاست کے فقدان کے باعث اور منافع بازی کی شراب کے نشہ میں ایک روز ایشیا کے مقابلہ میں ایسی مُنہ کی کھانی پڑے گی کہ صدیوں کا غرور اور افتخار خاک میں مل جائے گا۔ اور قرائن سے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ کا وقت قریب آگیا ہے ؛

یورپ کی نئی تعمیر کے ضمن میں جو بڑی بڑی اقتصادی تجاویز زیر غور ہیں صرف اسی حالت میں قابل پذیرائی ہو سکتی ہیں جس صورت میں کہ مشرق کا سوال اور اس کی سب ضمنی صورتیں اس طور سے اور اس خوش اسلوبی سے سلجھائی جائیں کہ عوام الناس

بھی اس سے مطمئن ہو جائیں یعنی ایک محکوم قوم پر ایک ایسے باضابطہ اور منظم طریق سے شہر یاری کی جائے جو استبداد کی پالیسی اور خود غرضانہ تجارتی مفاد سے آزاد ہو کر محکوم کے زاویہ نگاہ سے قابل تسلیم ہو ؛

اب وہ وقت نہیں رہا کہ ایک قوم محض اقتصادی سرفرازی کے بل پر دوسری قوم کو دبائے رکھے اور یہ وہی اقتصادی مسئلہ یا سوال ہے جو ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگ آزادی (AMERICAN WAR OF INDEPENDENCE) کا باعث ہوا تھا اور آج وہی صورت ایشیا میں نمودار ہو رہی ہے خدا کرے کہ ایک بار پھر ایسے انصاف پسند سیاستدان بھی کہیں سے پیدا ہو جائیں جن کے دم قدم کی بدولت کنیڈا۔ آسٹریلیا۔ اور جنوبی افریقہ کے متنازعہ مسائل خوش اسلوبی سے طے ہو کر خوشحالی کا دَور دَورہ ہو گیا تھا۔ آج مشرق اور مغرب کو بھی ایسے ہی اہلِ نظر کی ضرورت ہے ؛

ایک نئی دُنیا کی تعمیر کی وہ سب بلند بانگ اور شاندار تجاویز اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک مغرب کے اہل الرائے اور اہل نظر اقوام مشرق کے مطالبات کو گوش ہوش سے نہ سُنیں اور ان سے انصاف نہ کریں۔ ترک ان قوموں میں سب سے پیش پیش ہیں۔ جن کی تالیف قلوب کی اہل یورپ کو سب سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ یورپ سے ایشیا کو جانے والے جس قدر مشہور راستے ہیں ان پر ترک قابض ہیں اور ان سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ کوئی حکمران اور نہ ہی کوئی تاجر جو "مشرق قریب" اور "مشرق وسطیٰ" سے تجارتی تعلقات پیدا کرنا چاہتا ہو ان گذرگاہوں کو استعمال کر سکتا ہے ؛

وہ قوم خواہ ترک ہوں یا فرانسیسی، انگریز ہوں یا روسی ان میں سے جو کوئی بھی "عالم اسلام" پر حکمران ہوگی اُسی کے ہاتھ میں بر اعظم ایشیا کی سیادت بھی ہوگی اور جس شخص کے ہاتھ سے خواہ وہ سرزمین ایشیا کا کوئی تاجدار ہی کیوں نہ ہو یہ سیادت نکل گئی اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی سلطنت کے استحکام کا زمانہ بھی ختم ہو لیا ؛

"تاریخ عالم گذشتہ پانسو سال سے ترکوں کی اصلی عظمت کا باعث صرف یہ بتلاتی چلی آرہی ہے کہ دوَل عظام اور ایشیا میں انہی کے دم سے سروری کا تناسب قائم چلا آرہا ہے۔ برطانیہ اور ترکی کی جنگ کے موقع پر قسطنطنیہ اور دہلی میں جو ایک "روحانی کشش" یا ذہنی تعلق نظر آتا تھا اس کی بھی یہی وجہ تھی۔ اسی طرح مسٹر لائیڈ جارج کا ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی راہنماؤں کو برطانیہ اور ترکی کے مباحث میں شامل ہونے کی دعوت دینا بھی اس کی ایک کھلی دلیل ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس زمانے میں جب ناممکنات بھی ممکنات ہوسکتے ہیں سلطنت برطانیہ کی قسمت صرف "اسلام" کے ساتھ وابستہ ہے۔ ترک جو ایک مانی ہوئی بہادر۔ غیور اور جنگ آزما قوم ہے اور جس کی قدیمی روایات نہایت شاندار ہیں آج بھی اس بات کی اہل ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ وہی کریں اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ کہ اقوام مغرب اس کے مغربی نظریات کو تسلیم کرلیں ؛

جہاں تک ایشیائے کوچک کا سوال ہے ۱۹۱۹-۲۳ء تک سب سے زیادہ حل طلب سوال یہ تھا کہ دیکھیں ترک یورپ کا ساتھ دیں گے یا اس سے علیحدہ رہینگے کیونکہ ترک ایشیا کے سیاسی میدان میں ہمیشہ پیش پیش اور سب سے زیادہ طاقتور

تسلیم کئے گئے ہیں اور یقیناً ترکوں جیسی منصف مزاج اور بہادر قوم سے دوستی پیدا کر لینا کوئی ایسا مشکل کام نہیں بشرطیکہ ہم میں اس بہادر قوم کی دوستی حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ خصوصیت سے اُس نے جب سے "ایشیائے کوچک" کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا ہے روزِ اوّل سے اس کا یہی ایک مطالبہ رہا ہے کہ من حیث القوم دیگر اقوام عالم کے دوش بدوش اسے بھی امن سے رہنے دیا جائے اور اس کے اندرونی اور ملکی معاملات میں کوئی دوسرا دخل نہ دے ۔

ترکوں نے قوتِ بازو سے جو شہرت اور ناموری حاصل کی ہے۔ یورپ کے سیاستدانوں کی آنکھ میں یہ خار بن کر کھٹک رہی ہے اور اسی لئے یورپ ترکوں سے اس قدر خائف ہے کہ ایک مدت سے انہیں سرزمین مغرب سے نکالنے کی تگ ودو میں لگا ہوا ہے اور گذشتہ چھ سو سال میں جو شاندار اور قابلِ رشک کارنامے ترکوں نے کر دکھائے ہیں۔ سلاطین یورپ اور مغرب کے سیاستدان ان سے بیٹھے بیٹھے گھبرا اُٹھتے ہیں اور اس مردِ حق نواز کے خلاف ہر وقت ایک ناپاک اور غیر شریفانہ پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور وہ عظیم الشان سلطنت جو کبھی تین برّاعظم اور تین سمندروں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور "خلافت عثمانیہ" کے معزز لقب سے ممتاز تھی۔ دو سو سال تک اغیار کی ریشہ دوانیوں اور چالبازیوں کا تختۂ مشق بنتے بنتے اب صرف ایک "تاریخی یادگار" باقی رہ گئی ہے اور بقول حضرت علامہ اقبال ع

تھے سراپا ناز جو ہیں آج مجبورِ نیاز!

اور اسے تو قدرت کا ایک کرشمہ ہی سمجھئے کہ جب کبھی ترک دشمنوں کے نرغے میں بُری طرح سے گھرے ہوئے نظر آئے اور ان کی تباہی یقینی معلوم ہونے لگی تو تائید ایزدی

سے وہ ہمیشہ ان مخصموں سے زیادہ کامیاب ہو کر ابھرے"۔ انقلاب روس" کے بعد جب زار کی حکومت کی وہ تمام تجاویز جو روسی سلطنت پیٹر اعظم کے وقت سے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کیلئے بروئے کار لا رہی تھیں ختم ہوئیں تو ترک یورپ کے سیاسی مطلع پر پہلے سے بھی تابندہ تر نظر آنے لگا یعنی ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ "اہلِ اسلام" جو انیسویں صدی میں لندن اور پیرس پہ بھروسہ کئے بیٹھے تھے اچانک ماسکو کی طرف جھک گئے حالانکہ ۱۹۱۷ء تک وہ روس کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتے تھے اور یہ کسے معلوم نہیں کہ روس اصولاً اسلام کا سخت مخالف ہے ۔اس تبدیلی کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں کہ یورپ میں رائے عامہ مسلمانوں کے خلاف ہو گئی تھی اور یہ لوگ اس نکتہ کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھے کہ مغربی تہذیب اور تمدن کی بقا اس وقت صرف ماسکو اور ایشیا کی ہار جیت پر موقوف ہے اسی طرح اہلِ انگلستان بھی اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکے کہ ان کی سلطنت کو مشرق کے دور دراز علاقوں سے ملحق کرنے والے تمام راستے مسلمانوں کے قبضے میں ہیں اور ہمیں ان تک پہنچنے کیلئے یا تو ترکی میں سے گزرنا پڑتا ہے یا اور اسلامی ممالک میں ہو کر جانا ہوتا ہے اور یہ وہ تجارتی شاہراہیں ہیں جو دنیا کی اقتصادی زندگی میں انتڑیوں کا کام دیتی ہیں اور جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا میں جس قدر خون خرابہ ہوا ہے زیادہ تر انہی راستوں پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہوا ہے۔

اور جب تک ان شاہراہوں کی چابی ترکوں کے ہاتھ میں ہے مغرب کی تمام حکومتوں کو ترکوں سے ہی واسطہ پڑیگا اور باوجود ترکوں کے خلاف زہر اگلنے کے دستِ سوال بھی انہی کے آگے دراز کرنا پڑے گا ؛

حقیقت میں یورپ کے سیاستدان اسلام اور مسلمانوں کے متعلق آج تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور مسیحیت صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اسی روش پر قائم ہے جو اسے باز نطینی (BYZANTINE) مؤرخوں سے ورثہ میں ملی ہے۔ اور مسلمانوں کے خلاف آج تک جس قدر تحریکیں ہوئی ہیں ان کے ذمہ دار بھی یہی تنگدل اور متعصب مؤرخ ہی ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو اہل یورپ کے دلوں میں اسلام کے متعلق من گھڑت تاریخی ڈھکوسلوں اور مسلمانوں کے مظالم کی فرضی داستانوں سے بغض و نفرت پھیلاتے رہتے ہیں اور انہیں ہمیشہ یہی تعلیم اور تلقین کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ مفتوح قومیں جب برسر اقتدار ہو جائیں تو اپنے پہلے حکمرانوں سے وہ جیسا بھی سلوک روا رکھیں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں اور قدرت کا آئین بھی تو یہی ہے کہ فاتح مفتوح کو ذلیل و خوار کرے۔ دُنیا میں مذہب عیسوی کے پرچاروں اور مسیحی سلطنتوں کے سیاستدانوں کو جب کبھی اسلام کا خطرہ محسوس ہوا تو اُنہوں نے ہمیشہ ایسے ہی اوچھے ہتھیاروں سے کام لیا اور دُنیا کو دھوکے میں رکھ کر اپنا اُلّو سیدھا کیا ہے ؛

پوپ پائس دوم (PIUS II) نے جو بنی نوع انسان کا بڑا ہی ہمدرد متصور ہوتا تھا ترکوں کے خلاف کروسیڈ (مذہبی جہاد) کا اعلان کرنے سے پیشتر سلطان محمدؒ فاتح اور اس کی زیر سیادت جو اقوام تھیں انہیں مذہب عیسوی قبول کرنے کی

دعوت دی اور اس کے ساتھ یہ لالچ بھی دیا کہ اگر سلطان عیسائی مذہب اختیار کرے تو پوپ اسے مسیحی دنیا کا سردار اعظم یعنی "سپریم ہیڈ آف کرسچینیٹی" اور یورپ کا "مذہبی سالار" تسلیم کر لے گا۔

اور یہ کہنا غالباً کچھ غلط نہ ہوگا کہ یہی دعوت اور احمقانہ پیشکش ترکوں اور یورپ کے درمیان منافرت کا ایک بڑا باعث بنی۔ ممکن ہے کہ یورپ ترکوں کی عالمگیر یلغار اور اپنی شکستوں کو بھول ہی جاتا اگر ترک بھی ان اقوام کی طرح جو دُور ملکوں سے آکر یورپ میں آباد ہوئیں عیسائی مذہب قبول کر لیتے یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

دانایانِ فرنگ اسی مذہبی تخالف کی وجہ سے مسلمانوں سے ہمیشہ منافرت رکھتے چلے آئے ہیں اور اسی مذہبی تنگ نظری کے باعث مشرق میں اہل مشرق کے فلاح و بہبود کی تمام تجاویز جن کا اصلی مقصد مغرب اور مشرق کے ساکنوں میں اخوت کا ایک عالمگیر رشتہ پیدا کرنا ہے ناکام ہوتی چلی آئی ہیں۔ یہی وہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایک ایسی کشمکش پیدا ہو چکی ہے جو رکتی نظر نہیں آتی۔ اور اسی کشمکش نے مشرقی مسائل کو اتنا اُلجھا رکھا ہے کہ ان کے سلجھانے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ اور یہی وہ تعصّب ہے جو دُنیا کے خرمن امن میں ہمیشہ آگ لگاتا رہتا ہے گذشتہ زمانے میں بھی مذہب کے پردے میں جس قدر مظالم اور خونریزیاں ہوئیں ان کی تہ میں بھی یہی مذہبی جنون ہی کارفرما تھا اور ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

انگلستان کے سیاسی حلقوں میں اسلام اور ترکوں کے متعلق دو مختلف خیال کے آدمی پائے جاتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں ایڈنبرا میں رچرڈ کابڈن (RICHARD COBDEN) نے ایک مشہور کتاب "رشیا بائی اے مانچسٹر مینوفیکچرر (RUSSIA BY A MANCHESTER MANUFACTURER) شائع کی تھی جس میں انگریزوں کی روسیوں کے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفت پر بحث کرتے ہوئے یہ بتلایا گیا تھا کہ لوگ کیوں ترکوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور سلاطین یورپ کیوں آئے دن سلطنت ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجاویز سوچتے رہتے ہیں۔ اس بحث کے دوران میں مصنف نے انگریزوں پر یہ حقیقت بھی آشکارا کردی تھی کہ اگر ترکوں کے خلاف یہ تجاویز کامیاب ہوگئیں۔ تو اس سے مشرق کے نقشے میں جو ردوبدل لازمی طور پر ہوگا اس سے سلطنت برطانیہ بہت فائدے میں رہے گی*

اس کتاب نے انگلستان کے آزاد خیالوں میں بھی ترکوں کے خلاف منافرت کا ایک شدید جذبہ پیدا کردیا اور پامرسٹن سے گلیڈسٹون اور گرے سے ایسکوئتھ تک جو بہت بڑے آزاد خیال لیڈر کہلاتے تھے یہ سب لوگ عمر بھر اسلام اور ترکوں کی مخالفت پر تُلے رہے اور جو پالیسی روس نے سلطنت عثمانیہ کیلئے وضع کر رکھی تھی وہی ان لوگوں کا مسلک تھا یہ لوگ زندگی بھر اسی تمنا میں رہے کہ کبھی تو وہ بھی قسطنطنیہ کے ایوان پر صلیب کا پرچم لہراتا ہؤا دیکھیں اور آج بھی ان لوگوں کو یہی امید ہے کہ رُوسیوں کو جب اپنے موجودہ انقلاب کی گتھیاں سلجھانے سے فرصت ملیگی تو وہ ازسرنو قسطنطنیہ کو روس کے ساتھ ملحق کرنے کے مسئلے کی طرف متوجہ ہوجائینگے۔ واللہ کسی مؤرخ نے کیا خوب کہا تھا کہ زار کی حکومت انگلستان کی "لبرل گورنمنٹ" کو جس

ناچ چاہے نچا سکتی ہے اور آج دُنیا دیکھ رہی ہے کہ اس مؤرخ کا کہنا غلط نہیں تھا۔

یورپ میں ترکی اور اسلام پر ڈیوڈ ارکوہارٹ (DAVID URQUHART) سے بہتر اور مستند دُوسرا مؤرخ نہیں گزرا۔ اس شخص نے یورپ اور برطانیہ کے مدبروں کو ترکی میں ایسی اصلاحات نافذ کرانے کی غلط روش سے باز رکھنے کی پوری پوری کوشش کی ہے جو اصلاحات سینٹ پیٹرزبرگ (دارالخلافہ رُوس) کے سرکاری دفاتر کی دماغ سوزی کا نتیجہ تھیں۔ اُس نے مشرق میں اس پالیسی کی جس کی مثال اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ "ہاتھی کے کھانے کے دانت اور دکھانے کے اور" سخت الفاظ میں مذمت کی تھی اور مسلمانوں کو اپنی شاندار روایات (جن کا وہ بہت مداح تھا) برقرار رکھنے میں مدد دینے اور دُوسروں کو ان سے فیضیاب ہونے کا موقع ملنے کی بڑے پُر زور الفاظ میں اپیل کی تھی اور اس بات پر زور دیا تھا کہ ترکوں کو سلاطین یورپ کے دوش بدوش یورپ کے نظام کی ترتیب اور ترکیب میں شامل کیا جائے کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ اگر مسیحی حکومتیں ان کے خانگی معاملات میں دخل درمعقولات دینا چھوڑ دیں تو ترک پھر ایک بار نہ صرف یورپ کے توازن کو استوار رکھنے میں مفید ثابت ہونگے بلکہ اس توازن کی حفاظت کیلئے ان کے پاس طاقت اور قوت بھی ہوگی اور ایشیا میں مغربی تہذیب کے اس طرح علم بردار بنے رہیں گے جس طرح ایام گذشتہ میں ان کی علم برداری کی شہادت اوراق تاریخ سے ملتی ہے۔

سنہ ۱۸۳۰-۷۸ء تک اس منصف مزاج اور حق پرست مؤرخ نے ہر موقع پر

اہل یورپ سے یہی اپیل کی کہ مغربی اقوام ہرگز ہرگز ترکوں کے اندرونی اور خانگی معاملات میں دخل نہ دیں اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنی حالت استوار کر کے مغرب کے اُن نکتہ وروں کے جنہیں مشرقی مسائل پر عبور رہا ہے اور جن کے دل سیاسی چالاکیوں اور شاطرانہ چالوں سے صاف ہیں دوش بدوش عالم اسلام کو مغربی تہذیب اور آئین شہریاری اور اندازِ جہانبانی سے آشنا کر دیں ؂

ڈیوڈ ارکوہارٹ دوّل عظام کے مشیروں کو ہمیشہ یہی مشورہ دیتا رہا کہ اصلاحات کا کام صرف ان لوگوں کے سپرد ہونا چاہیئے جو سیاست سے الگ رہ کر یہ کام کرنے پر آمادہ ہوں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ قابل قدر مشورہ موجودہ زمانے میں بھی اپنی اہمیّت اور ضرورت محسوس کرا رہا ہے اس سے بحث نہیں کہ یورپ کے ہٹ دھرم سیاست دان اسے قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں یا نہیں ؂

اسی نکتہ رس مؤرخ نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا تھا کہ مخالفین اسلام جس نقطۂ نظر سے مشرق کا سوال اہل مغرب کی رائے عامہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک دن کشت و خون کا باعث ہوگا۔ یورپ والے ابھی تک اس نکتہ سے بیخبر معلوم ہوتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے تعلقات صرف اس صورت میں استوار ہو سکتے ہیں اور دونوں سرزمینوں میں توازن قائم رکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں کہ ایک عالمگیر مذہب (اسلام) کے پیرؤں اور ایک بہادر قوم کو اپنے اختلافات آپ ہی مٹانے کا اور اپنی سیاسی گتھیاں خود ہی سلجھانے کا موقع دیا جائے اور ان کے معاملات میں دخل انداز ہونے سے احتراز کیا جائے ؂

وہ اقوام یورپ جنہیں انگلستان کے ملک الشعرا لارڈ بائرن نے "سوداگروں کا طائفہ" کا خطاب دیا تھا مسلمانوں اور زار کی حکومت کے خلاف جس قدر کُشت وخون ہُوا اِس کی روک تھام کیلئے کبھی ٹس سے مس نہ ہوئیں اور نہ ہی ان اندرُونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا کچھ انسداد کرسکیں جو ایک عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں ٭

اگر مشرق کی مسیحی اقوام اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے ترکوں کے خلاف بیرونی حکومتوں سے ساز باز کرنے سے گریز کرتیں اور یورپ کے سیاستدانوں کے جال میں نہ پھنستیں تو شاید وہ کچھ زیادہ فائدہ میں رہتیں لیکن خود غرضی اور تعصّب کی بدولت ان پر آخر وہی مثال صادق آتی ہے کہ ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شُد ٭

۱۸۵۶ء میں "کانگریس آف پیرس" کے بعد رُوس نے ترکوں کے متعلق جو پالیسی وضع کی وہ دولتِ عثمانیہ کیلئے بہت مہلک اور خطرناک تھی۔ روس کی یہ سیاسی چال بہت گہری تھی اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ترکی مقبوضات کے حصّے بخرے کر ڈالے جائیں اس چال کو کامیاب بنانے کیلئے یہ ضروری تھا کہ پیروانِ مسیح علیہ السلام کو توحید کے نام لیوؤں کے خلاف اُبھارا جائے اور خصوصیت سے ترکوں کے خلاف یورپ میں ایک منظم پروپیگنڈا کیا جائے تاکہ یورپ کے سب عیسائی تاجدار ترکوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں اور ان غریبوں کو محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں کبھی سُکھ کا سانس نہ لینے دیں ٭

"نیا آئین" جو سلطنت ترکی میں مُلکی اور سیاسی اصلاحات کا پہلا قدم تھا۔ محض اس قسم کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث ناکام رہا کیونکہ مشرق کے

عیسائیوں کو ہر وقت بیرونی امداد کا یقین دلاتے رہنا اور ترکوں کے خلاف ابھارتے رہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی سرکش گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی جائے اور وہ جدھر چاہے بھاگا پھرے ؛

صرف لارڈ بیکنفیلڈ کا یہ خیال تھا کہ مسلمان آج بھی اسی اعتماد کے اہل ہیں جس اعتماد کے وہ آج سے صدیوں پہلے حقدار تھے۔ لارڈ موصوف آج بھی ترکوں کو مسلمانوں کی سیاسی۔ اقتصادی اور تمدنی تعلیم کا رہنما اور رہبر تسلیم کرتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جس طرح گذشتہ سو سال سے مسلمانوں کے حقوق تسلیم ہوتے رہے ہیں اور جو امور صرف مسلمانوں کی ذات سے متعلق ہیں آج بھی اُن کا سیاہ و سپید پہلے کی طرح ترکوں کے ہاتھ میں رہے لیکن افسوس ! انگلستان اپنی خانگی کشمکش کے باعث جس میں گلیڈسٹون کی شخصیت بہت نمایاں تھی لارڈ بیکنفیلڈ کا یہ مشورہ سمجھنے یا تسلیم کرنے سے قاصر رہا اور یہ کون نہیں جانتا کہ گلیڈسٹون تو وہ متعصب انگریز تھا جس کے رگ و پے میں اسلام کی مخالفت سمائی ہوئی تھی اور یہ اسی تعصب اور تنگ نگاہی کا نتیجہ تھا کہ مشرق کے متعلق برطانیہ کی خیر سگالی کی پالیسی ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی اور حکومت انگلستان ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں حکومت زار کی ہم نوا ہی رہی۔ نتیجہ ظاہر تھا مسلمانوں کی تباہی ! حالانکہ حالات کا تقاضا یہ تھا۔ کہ حکومت برطانیہ اپنے مشرقی مفاد کے پیش نظر مسلمانوں کے تالیف قلوب کی کوشش کرتی عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہو جانے سے صرف کسی ایک کا ہی نہیں بلکہ دونوں کا فائدہ تھا لیکن افسوس انگلستان کے سیاستدانوں نے مسلمانوں کے متعلق جب بھی قدم اُٹھایا غلط اُٹھایا ؛

مدحت پاشا کی صدارت میں اصلاحات کی کانفرنس جو ناکام رہی اس کی تہ میں بھی مخالفانہ اور ضرر رساں حکمت عملی کارفرما تھی لیکن انگلستان کی آنکھیں "بوئر وار" (BOER WAR) کے بعد کھلیں جب اسے جرمن "ہوّا" ہر طرف نظر آنے لگا۔ ادھر سلطان عبدالحمید خاں غازی نے جب اپنے تدبّر سے ترکوں میں پھر ایک بار قومی زندگی کا جذبہ پیدا کر دیا اور ترک اپنے اختلافات بھول کر مادرِ وطن کی خدمت کے لئے متحد ہو گئے تو یورپ کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ ترکوں کے اس قومی اتحاد میں یورپ کو اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی اور مغربی سیاست کے بڑے بڑے خرانٹ شاطر پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور اپنی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کے خلاف پھر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ اس وقت ترکوں کو جرمنی کی دوستی پر جھوٹا سچّا بھروسہ تھا اور جرمنی اور ترکی کی دوستی دربار انگلستان کے لئے خطرے سے خالی نہ تھی۔ اس لئے انگریزوں نے ترکی کے خلاف روس سے سازباز شروع کر دی اور ایڈورڈ ہفتم بادشاہ اور زار روس کی ملاقات کا انتظام کیا گیا چنانچہ دونوں تاجدار ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس دوم جب ریوالی کے مقام پر ایک دوسرے سے ملے تو اہلِ انگلستان نے اس ملاقات کو اپنے لئے ایک نیک فال سمجھا اور بڑی خوشی کا اظہار کیا ؛

لیکن ۱۹۰۸ئ میں ترکی میں جو اچانک انقلاب رُونما ہُوا۔ اُس نے یورپ کی امیدوں پر پھر پانی پھیر دیا۔ مشرق کا سیاسی مسئلہ ترکوں کے تعاون کے بغیر حل ہونے کی چونکہ کوئی اُمید نہ تھی۔ اس لئے دربار انگلستان کے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ترکوں کا اعتماد حاصل کرے ادھر ترکوں نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھانے کو

انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ کیونکہ انہیں بھی اب جرمنی سے دوستی مہنگی پڑتی نظر آ رہی تھی۔ حکومت جرمنی نے تیس سال تک سلطان عبدالحمید خاں کی نمائشی حمایت کر کے سلطان سے بے شمار مراعات حاصل کر لی تھیں لیکن ترک جیسے تھے ویسے کے ویسے ہی رہے۔ انگریز پہلے ہی ترکوں سے دوستی کا خواہشمند تھا ترکوں کو بھی انگریز کی دوستی میں فائدہ نظر آ رہا تھا آخر دونوں سلطنتوں میں پھر ایک بار صلح صفائی ہو گئی اور انگریزوں کے لئے بھی یہ ایک مبارک موقع تھا کہ انہیں پھر ایک بار مسلمانوں کا جو ترقی اور تہذیب کے ہمیشہ دلدادہ رہے ہیں۔ اعتماد حاصل ہو گیا۔ اور یہی وہ اعتماد تھا جس کی بدولت وہ آگ جو ایک مدت سے مشرق میں سُلگ رہی تھی پھر دبائی جا سکتی تھی اور مسلمانوں کی تالیف قلوب کا بھی اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ گلیڈسٹون کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب نے بیکن فیلڈ کی بلند نظری اور صلح کوشی کی پالیسی سے منحرف ہو کر برطانیہ کو پھر ایک بار غلط راہ پر ڈال دیا چنانچہ اس قدر مخالف عنصر کی موجودگی میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی کا ناکام ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی ٭

ادھر یورپ کے ماہرین سیاست بھی تاک میں تھے۔ اُنہوں نے موقع پاتے ہی ترکوں کی سیاسی غلطیوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مشرق میں جو اصلاحات کا کام جاری ہو چکا تھا اس میں رخنہ اندازی شروع کر دی اور آخر ۱۹۰۸ء کے انقلاب کا نتیجہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کی شکل میں نمودار ہُوا اور ترکوں کو جب وزرائے انگلستان کی دوستی میں موت کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا اور ۱۴-۱۹۱۳ء میں ایڈریانوپل کو چک

میں اصلاحات نافذ کرنے کے معاملہ میں بھی دربارِ انگلستان سے کسی قسم کی مدد کی اُمید نہ رہی تو اُنہوں نے پھر ایک بار جرمنی کا دامن پکڑا ؎

انگلستان میں ترکوں کے چند ایک مخلص انگریز دوستوں نے جو جنوبی افریقہ اور کنیڈا کی گتھی سُلجھانے میں نام اور شہرت پیدا کر چکے تھے ترکوں کی خاطر "ایشیائے کوچک" میں اصلاحات کے کام میں مدد دینے پر آمادگی ظاہر کی (یہی وہ لوگ تھے جو "ڈیوڈ اُرکوہارٹ" کے نظریہ کے قائل تھے)۔ ان لوگوں نے جنگِ یورپ (۱۹۱۴ء) سے کچھ روز پہلے دفترِ خارجہ سے اپنے نیک ارادوں کے متعلق گفت و شنید کی لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ معاملہ کو چونکہ بگڑنا تھا بگڑتا ہی چلا گیا اور انگریزی سیاست کے متعصب اور تنگ دل شاطروں کی طفیل عالمِ اسلام اور سلطنت برطانیہ میں ربط و اتحاد کا ایک اور زرین موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ انگریزوں نے ترکی میں جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر روس سے اتحاد کر کے مسلمانوں سے بگاڑ لی۔ جس کے بُرے نتائج جو رنگ لائے کسے معلوم نہیں لیکن قدرت نے پھر ایک بار اہلِ انگلستان کی مدد کی اور محض ایک معجزہ کے طور پر روس میں خاندان "رومانوف" اور جرمنی کے شاہی خاندان "ہانز ولرن" کے تنزل نے انگریزوں کے لئے پھر ایک بار مشرقِ قریب کا راستہ صاف کر دیا۔ اس وقت گلیڈسٹون کے ہم خیال محض ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتے تھے اور یورپ کا "مردِ بیمار" بھی (ترکوں کو یورپ والے مردِ بیمار کہتے تھے) جس میں اس عالمگیر کشت و خون (جنگِ عظیم) کے بعد بھی ابھی بسد رمق جان تھی کچھ دم خم دکھلا رہا تھا ؎

ایشیائے کوچک میں ترکی کی قومی تحریک پھر ایک بار کسی خودرو بیل کی طرح اُبھرتی اور پھیلتی نظر آنے لگی اور اس تحریک نے پھیلتے پھیلتے ترکوں کے مخالفین کو بھی اپنے

جال میں لے لیا اور انہیں بتلا دیا کہ مشرق قریب میں تم لوگ ایشیائے کوچک کے حکمرانوں کے اتحادِ عمل کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے ؎

اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسے نازک موقع پر سلطنت برطانیہ جیسی باعظمت اور باسطوت حکومت کیا محض مذہبی تعصب کی بنا پر مسلمانوں پر اہل یونان کی قیادت گوارا کر لے گی۔ حالانکہ اس کا یہ فرض تھا کہ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے حق اور باطل میں منصفانہ فیصلہ کر دے۔ دورانِ جنگ میں یونان کے پولٹیکل راہنما "وینیزولانہ" نے شاید عارضی اور سطحی مفاد کا ایک ہیولیٰ بنا کر دانایانِ فرنگ کو مرعوب کر لیا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونان نہ تو فوجی نہ سیاسی اور نہ ہی مالی نقطۂ نظر سے اس قابل ہے کہ اسے ترکوں پر فوقیت دی جائے ؎

لیکن یہ ایک معمّا ہی ہے کہ ۲۳-۱۹۲۰ء تک دربارِ انگلستان نے ترکوں کے مقابلے میں یونان کو ہمیشہ فوقیت دی۔ اب رہا اس معما کا حل تو حل سے پیشتر دو باتیں غور کرنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونانی کلیسیا نے وہی اصول تسلیم کر لئے جس پر یونان کے کٹر لوگ گام زن تھے۔ ان دو مختلف الخیال مذہبی گروہوں کے اتحاد کا صرف یہ مطلب تھا کہ کسی طرح مل ملا کر قسطنطنیہ پر یونان قابض ہو جائے۔ اس مذہبی اتحاد کا جہاں تک انگلستان سے تعلق ہے تو انگلستان میں اس تحریک کا سرگرم معاون اور محرک لارڈ رابرٹ سیسل اور اس کا بھائی تھا یہ دونوں یورپ سے ترکوں کو نکالنے کے خواب ایک مدّت سے دیکھتے رہتے تھے اور انہی دو بھائیوں کی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ مسیحی علما بشپ آف کنٹربری۔ بشپ آف لندن اور بشپ آف مانچسٹر کو جب بھی

موقع ملتا اسلام اور ترکوں کے خلاف عیسائیوں کو بھڑکاتے رہتے اور اسی طائفہ میں لائڈ جارج اور اس کے چیلے چانٹے تھے جن کا مقصد واحد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جیسے بھی ہو ترکوں کی سلطنت کا نشان مٹا دیا جائے ؛

مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی خود مختاری کے مطالبات کا جواب جو ورسیلز اور جنیوا کی کانفرنسوں میں یورپ کے سیاست دانوں نے دیا وہ یہ تھا کہ ہیاٹی (HAITI) ایسی چھوٹی سی ریاست کے حبشیوں کو تو ان کانفرنسوں میں شامل کر کے ان کا حق نیابت تسلیم کر لیا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں حکومت افغانستان کے سفیر کو اور ۱۹۲۲ء میں غازی مصطفٰے کمال پاشا کے نمائندے کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کمینگی اور تنگ نظری کا باعث صرف ان لوگوں کا مذہبی جنون تھا جو رہتی دنیا تک ان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن کر چمکے گا افسوس تو یہ ہے کہ یہ لوگ مسیح کے پیرو کہلاتے ہوئے مسیح کی تعلیم سے بالکل کورے نظر آتے ہیں ؛

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ ان سرمایہ دار تاجروں کا مکروہ طائفہ ہے۔ جو ایشیا کو ہمیشہ ایک تر و تازہ دودھ دینے والی گائے سمجھتے ہیں اور ایشیا کے رہنے والوں کو محض بار برداری کے جانور۔ ان کے نقطۂ خیال سے اہل انگلستان کی وہی حیثیت ہے جو ایک کمپنی کے منافع تقسیم کرنے والوں کی ہوا کرتی ہے اور سلطنت برطانیہ نے ایشیا کے متعلق جو محض "جلب زر" کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کے ذمہ دار بھی یہی سرمایہ دار ہیں۔ اور یہ بھی انہی لوگوں کی کرامت ہے کہ دنیا میں ابھی تک اقتصادی

اتحاد کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور نہ ہی آج تک کوئی اللہ کا بندہ بین الاقوامی اصولوں پر کاربند ہوتا نظر آتا ہے۔ کیا ستم ہے کہ آج من حیث القوم یہ انگریز بھی جنہوں نے کبھی اقوامِ عالم کے لئے ایک عالمگیر اتحاد کی بنیاد رکھی تھی آج تنگ نظر۔ زر پرست اور حرص و ہوس کے بندوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں جو زمین اور آسمان میں صرف اپنا ہی فائدہ ڈھونڈھتے ہیں۔ حالانکہ انگلستان میں کچھ اہل نظر ایسے بھی ہیں جو حکومت کے استحکام کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دُنیا کو قولاً و فعلاً یہ یقین دلا دیا جائے کہ انگریز بنی نوع انسان کے بلا تفریق مذہب و ملّت حقیقی خیر خواہ ہیں سلطنت کی وسعت اور عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا دُشوار اور مشکل کام بھی نہیں بشرطیکہ حکومت برطانیہ ایشیا اور خصوصیت سے مسلمانوں کے متعلق کوئی صلح کُن اور بے غرضانہ حکمت عملی اختیار کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک انگریز ترکوں سے اخوت اور دوستی کا رشتہ استوار نہیں کر لیتے اور مسلمانانِ عالم کی تالیف قلوب بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جب حرم کے پاسبانوں کو بھی انگریزوں کی دوستی پر بھروسہ ہو۔

(۳)

جب سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی جہانبانی ترکوں نے عباسیہ اور امیہ خلفاء سے ورثہ میں پائی ہیں وہ اسی روز سے اسلام کے تحفظ کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں۔ اور شروع سے ہی اس عدل و انصاف اور تلطف و مدارات اور مذہبی آزاد خیالی کی پالیسی پر کاربند ہیں جو ان کے سلف کا سب سے بڑا وصف تھا اور آج جو ہم سلطنت ترکی میں جابجا غیر ملکیوں کی درسگاہیں اور مذہبی انجمنیں دیکھ رہے

ہیں یہی ترکوں کی عالی ظرفی، بلند خیالی اور مذہبی رواداری کی سب سے بڑی دلیل ہے
لیکن کیا ستم ہے کہ آج سالہا سال کے کشت و خون کے بعد ایک بچی کھچی سی جو سلطنت ان
کے پاس رہ گئی ہے تنگدل اور متعصب اہل یورپ کو یہ درماندہ سی سلطنت بھی ایک ہوّا
نظر آرہی ہے اور آج جو ترک اس چھوٹی سی سلطنت کو قومی حکومت کا درجہ دینا چاہتے
ہیں تو یورپ اپنی جبلی ریشہ دوانیوں سے اس کام میں بھی روڑا اٹکا رہا ہے ۔ حالانکہ
قومیت کا یہ جذبہ خود تمام یورپ میں پایا جاتا ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ ڈوبتے کو سہارا
دیا جائے لیکن ہو رہا ہے اس کے برعکس ۔ ڈوبتے کو جو تنکے کا سہارا سا بھی ہے ۔
یورپ کو آج وہ بھی گوارا نہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ترکوں کی تنظیم میں یورپ
کو خطرے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ اس لئے دنیا بھر کی برائیاں ترکوں کے سر
تھوپی جاتی ہیں ۔ اور انہیں بدنام کرنے کے ناپاک پراپیگنڈے میں کبھی کمی گوارا نہیں
کی جاتی ۔

کیا تماشہ ہے کہ ایک طرف تو ترکوں سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک
میں اصلاحات نافذ کریں اور جب وہ غریب اس طرف کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو پھر
طرح طرح سے انہیں پریشان کیا جاتا ہے اور ان کے ہر کام میں خواہ وہ کتنے ہی
خلوص سے کیا جائے میں میخ نکالی جاتی ہے ۔ حالانکہ ۱۸۳۹ء سے ہی ترکوں
سے اسی "قومی تنظیم" کا ہمیشہ سختی سے مطالبہ کیا جاتا رہا ہے حقیقت صرف اس قدر
ہے کہ نومبر ۱۹۲۲ء سے انقرہ میں جو ایک قومی تحریک شروع کی گئی ہے مخالفین
کی آنکھ میں ایک خار بن کر کھٹک رہی ہے اور ترکوں کی مخالفت کا اصلی مطلب

تمام عالمِ اسلام کی مخالفت ہے ٭

گیارھویں صدی سے دُنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں نے کم وبیش تنظیم کا کام جاری کر رکھا ہے اور اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے اصلاحی کاموں سے کبھی پہلوتہی نہیں کی۔ ساری مصیبت کی جڑ اسلام میں فرقہ بندی کی لعنت ہے جو کسی کام کو پروان نہیں چڑھنے دیتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کو جب بھی موقع ملا ہے۔ ایشیا کی پست ماندہ اقوام کو سہارا دینے اور اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کوششیں کیوں بار آور نہیں ہوتیں تو اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمان کبھی کسی بیرونی اثر سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ کسے معلوم نہیں کہ اسلام کے عالمگیر اصلاحی کام کے لئے دو چیزیں ازبسکہ ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ہر طرح کا اصلاحی کام ہر طرح کے مسیحی اثر سے پاک ہو۔ دوم اس کی تحریک کسی زبردست اسلامی حکومت کی طرف سے ہو اور وہی اس کام کی نگراں بھی ہو ٭

آج اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرنے کا اگر کوئی اہل ہو سکتا ہے تو صرف مسلمان ہو سکتے ہیں اور ترکوں نے ایمانداری کے ساتھ یہ شرائط پوری کر دی ہیں ٭

جو لوگ اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ "اسلامی اصول" ہر زمانے کے لئے مستند قرار نہیں دیئے جا سکتے اور ان کی یہ مذہبی روایات کا ڈھونگ کوئی اصلاحی کام

پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچنے دیتا سخت غلطی پر ہیں اور اس نکتہ کو آج تک نہیں سمجھ سکے کہ اگر یہ اسلامی اصول مستند نہ ہوتے اور یہ قدیمی اسلامی روایات ہر زمانے میں درخور اعتنا نہ ہوتیں تو پھر اسلام بھی اغیار کی یورشوں سے بار بار گر کر کبھی اُبھر نہ سکتا اس لئے یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہ اسلامی اصول کچھ اس قدر دلپذیر اور رسا دے سادے سے ہیں کہ ہر دل کو مسحور کر لیتے ہیں ؞

پروفیسر گولڈ زہیر (GOLD ZIHER) نے اپنی مشہور کتاب "لیکنز آن اسلام" (LESSONS ON ISLAM) میں یہ بات دلیل و بُرہان سے ثابت کر دی ہے کہ اسلام ہی صرف وہ مذہب ہے جسے جہاں کوئی اچھی چیز نظر آئی اُس نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ اقوام یورپ کے تمام الزام جو اسلام اور مسلمانوں کے سر تھوپے جاتے ہیں محض بے بنیاد ہیں۔ ہی قومیت اور قومیت کا مذہبی احساس تو اس سے کوئی قوم بھی بری الذمہ نہیں قرار دی جا سکتی۔ کوئی خواہ کیسا ہی تنگ دل کیوں نہ ہو اسے اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے اسلام کی تعلیم کا جواب نہیں۔ لیکن اسلام اور اس کے بعد کی اسلامی تاریخ دونوں میں بہت بڑا انضاد پایا جاتا ہے۔ مؤرخ جو چاہے کہہ دے لیکن اس میں کوئی شبہ یا شک نہیں کہ ترکوں نے قومی تنظیم کی طرف جو قدم اُٹھایا ہے اس کا اسلام کے مستقبل پر ضرور اثر پڑے گا۔ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے ترک اوّل درجے کا سیاست دان بھی ہے۔ جس روز سے اس نے عربوں نظر انداز کر کے مسلمانوں کی راہبری اور رہنمائی کا کام سنبھالا ہے اُسی روز سے اُنہوں نے

اپنی صلح کُل اور عدل و انصاف کی پالیسی سے یورپ اور ایشیا کے درمیان اتحاد قائم رکھا ہے ؛

جاپان سے بہت عرصہ پہلے انہوں نے ایشیا میں مغرب کی تعلیم کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا اور حکومت عثمانیہ نے نسلی امتیاز یعنی امتیاز " رنگ و بُو " کو مٹا کر ان دونوں برّ اعظموں کو اخوت کے ایک خوبصورت رشتہ میں منسلک کر رکھا ہے سیاسی پہلو سے ترکوں کا یہ کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے ؛

پروفیسر گولڈ زیہر (GOLD ZIHER) تسلیم کرتے ہیں کہ جب سے سلطنت عثمانیہ عالم اسلام میں ایک چوٹی کی سلطنت تسلیم ہونے لگی ہے اس نے تشدد کی حکمت عملی کو مٹا کر " ہاشمی " اخوت اور اسلامی ہمدردی سے اپنے زیرنگیں اقوام کے دلوں کو مسحور کر لیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت جب ترکوں کی فتوحات نے ایک دُنیا میں تھلکہ مچا رکھا تھا۔ عیسائیوں کو جو روز اوّل سے اسلام کے مخالف چلے آتے ہیں۔ مراعات عطا کرنا ان کی مذہبی رواداری۔ نسلی بلند خیالی اور قومی ایثار کی ایک ایسی شاندار مثال ہے جس کی نظیر اقوام یورپ کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی لیکن افسوس ہے کہ عیسائی مذہبی تعصّب کی وجہ سے کسی کا احسان تک بھی یاد نہیں رکھتے ؛

خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مبارک ارشاد ہے۔

" میری اُمت میں اختلاف رائے ہونا برکت کی دلیل ہے "۔

اختلاف ہر قوم میں ہوتا ہے لیکن مسلمانوں نے اسے کبھی مذہبی رنگ دے کر غیر مسلمو

کو آزار نہیں پہنچایا۔ اسلام کے دورِ اوّل میں غیر مسلمان اقوام کو جو مذہبی آزادی عطا کی گئی تھی۔ یہ پیغمبر اسلام صلعم کی ہی مبارک تعلیم کا نتیجہ تھا۔ قرآن (شریف) میں جو بار بار خدا کو ایک تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے صرف یہی مقصد ہے کہ مسلمان دیگر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں کیونکہ ان کا خدا بھی وہی ہے جو مسلمانوں کا خدا ہے۔ رسول عربی صلعم کا ایک ارشاد ہے۔

"اہلِ کتاب کے ساتھ ہمیشہ لطف و مدارات سے پیش آؤ۔"

پھر ایک اور موقع پر رسول عربی (صلعم) کا ارشاد ہے۔

"مذہب میں سختی مت کرو۔"

یہ دونوں ارشادات عین قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق ہیں مسلمان حکمرانوں نے ہر عہد میں ان ارشادات کو پیش نظر رکھا ہے اور ان پر عمل کیا ہے اور ان کے عمل سے غیر مسلم بھی ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

کبھی کا ذکر ہے کہ ہادیٔ اسلام نے ایک موقع پر نجران کے راہبوں۔ پادریوں اور اسقفوں کے نام ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ اگر تم اپنے عہد پر قائم رہو گے تو ہم مسلمان بھی تمہاری مذہبی آزادی اور تمہارے کلیساؤں کی حفاظت کے ذمہ دار رہوں گے۔

کسے معلوم نہیں کہ مدینہ میں محمد عربی (صلعم) نے اہلِ یہود کو اپنے طریق پر اپنے اپنے معبدوں میں عبادت کرنے کی اجازت عطا فرما رکھی تھی۔ اور صرف اس وقت انہیں شہر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا جب ان لوگوں کی شرارتیں اور ریشہ دوانیاں

اور آئے روز کی بدعہدیاں ناقابل برداشت ہو گئیں۔ سنہ ۱۰ھ میں جب پیغمبر اسلام نے یمن میں اپنا نائب بھیجا تو اُسے خاص طور پہ ہدایت فرمائی کہ خبردار کسی یہودی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے ÷

جب مسلمانوں نے ایران فتح کر لیا تو آپ نے حکم دیا کہ پیروانِ "زرتشت" سے بھی وہی سلوک کرو جس کے اہلِ کتاب مستحق ہیں ÷

خلیفہ معتصم کے عہدِ حکومت (۸۳۳-۴۲ء) میں ایک مسلمان جرنیل کو اس لئے معتوب کیا گیا کہ اُس نے پارسیوں کا ایک آتش کدہ گروا کر اس کی جگہ مسجد تعمیر کرا دی تھی لیکن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اس قسم کی شاندار رواداری کہیں شاذ و نادر ہی نظر آئے گی ÷

دسویں صدی میں جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو فتح کے تین سَو سال بعد تک بھی ایران کے آتشکدوں میں آگ کی پرستش ہوتی تھی اور اسلامی رواداری کا یہ حال تھا کہ لوگ کھلے بندوں اپنے معبودوں کو پوجتے تھے اور کوئی معترض نہ ہوتا ÷

ہندوستان میں بھی اسلامی فتوحات کے بعد اہلِ ہنود سے جو یہاں کے اصلی باشندے تھے یہی مذہبی رواداری برقرار رکھی گئی (گو بعد میں بعض سلاطین نے ان کے بعض بُتکدے مجبوری حالات میں مسمار کرا دیئے تھے) ہندوستان کی وہ سرزمین جو سندھ کہلاتی ہے سب سے پہلے پرچمِ اسلام یہیں لہرایا۔ یہاں کے ایک شہر براہمن آباد میں ایک ہندو مندر کو جو ہندو حکمرانوں نے مراعات دے رکھی تھیں مسلمانوں نے بھی انہیں برقرار رکھا۔ اور آج حیدر آباد اور بہاولپور کی اسلامی ریاستوں میں بھی ہندوؤں کے ساتھ

وہی اسلامی رواداری اور بلند خیالی برتی جا رہی ہے اور یہ دونوں ریاستیں پرانی روایات کے مطابق اہلِ ہنود کے مندروں اور شوالوں کے لئے وقتاً فوقتاً روپیہ دیتی رہتی ہیں اور ان کی قدیمی جاگیریں جُوں کی تُوں برقرار ہیں ٭

غیر مسلم جو اسلامی حکومتوں کے زیرِ سایہ رہتے تھے ذمی کہلاتے تھے۔ ذمی کو اپنے مسلمان حکمران کو ایک قلیل سی رقم بطور جزیہ دینی ہوتی تھی اور اس کے عوض اُسے مکمل مذہبی آزادی عطا کی جاتی تھی۔ اور حکومت ان کے جان و مال کی ذمہ دار ہوتی تھی ٭

پیغمبر اسلام صلعم کا ارشاد ہے۔

"جس نے ذمی کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی۔"

اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین کے لئے یہ وصیت کی تھی۔

"ذمیوں کی حفاظت تمہارے سپرد ہے۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ جو عہد نامہ ہم نے ان لوگوں سے کیا ہے اس کا احترام کرو اور ان کو ان کے دشمنوں سے بچاؤ اور ان سے کوئی ایسی خدمت نہ لو جسے وہ برداشت نہ کر سکیں۔"

سلاطین ترکی نے بھی ہر دور میں ذمیوں کو مذہبی آزادی دی ہے حکومت اسلامیہ کے دورِ اوّل میں کلیساؤں کو وہ مراعات حاصل تھیں جو بازنطینی حکومت میں بھی انہیں کبھی نصیب نہ ہوئیں ٭

یہ مذکورہ بالا واقعات "سر آرنلڈ" کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اسلامی تاریخ و اسلامی تہذیب اور تمدن کے مطالعہ کے لئے وقف کر رکھی تھی ٭

مسلمانوں نے تو مذہبی رواداری کو مدنظر رکھتے ہوئے جس قدر حسن سلوک ممکن تھا عیسائیوں سے ہمیشہ کیا لیکن کلیسا والوں نے جو قدم بھی اٹھایا مسلمانوں کے خلاف اٹھایا۔ جب بھی آواز بلند کی اسلام کے خلاف ہی کی۔ خلفا اور حکومت "بازنطین" کے درمیان جنگ وجدل کا جو ایک طویل سلسلہ قائم رہا۔ عیسائی درپردہ مسلمانوں کی مخالفت کرتے رہے آخران لوگوں کی دغابازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے تنگ آکر خلیفہ ہارون الرشید نے ان کے لئے یہ سزا تجویز کی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے مختلف لباس پہنا کریں۔ اور سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیئے جائیں لیکن مذہبی پیشواؤں نے ان حالات کے ماتحت بھی ان لوگوں سے وہی عدل وانصاف کیا جس کی تعلیم قرآن حکیم دیتا ہے ؎

اسلامی تاریخ کا اطالوی مؤرخ "ڈان لینو کیٹانی" لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے عدل وانصاف کے نقطۂ نظر سے ہر عہد میں غیر مسلموں سے وہی سلوک روا رکھا ہے جو وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ سولھویں صدی میں حکومت کا حکم یہ تھا کہ ذمی جب اپنا جزیہ ادا کرنے آئیں تو اُن سے لطف و مدارات سے پیش آؤ۔ اور ان کے کام میں آسانیاں پیدا کرو ؎

تھامس ارنلڈ لکھتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے مذہبی رسم ورواج اور خانگی معاملات کا سب کام غیر مسلم اقوام کے پیشواؤں کے سپرد تھا اور مسلمانوں کی مدارات اور نوازشات کی یہ حد تھی کہ عیسائی یا دیگر اقوام کے افراد جب کسی وجہ سے اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوتے تو ہمیشہ اسلامی ممالک میں آکر پناہ لیتے اور جزیہ کی

مقررشدہ قلیل سی رقم ادا کر کے پوری مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ÷

پندرھویں صدی کے اخیر میں ہسپانیہ کے مظلوم یونانی جب کلیسائی حکومت کے مظالم سے تنگ آ کر وطن سے نکلے تو انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے دامن میں ہی پناہ لی۔ اٹھارھویں صدی سے کچھ روز پہلے سلیشیا کے پروٹسٹنٹ بھی اسی تمنا میں رہتے تھے کہ جب موقع ملے ترکی ممالک میں جا کر آباد ہوں ÷

۱۷۳۶ء میں جب کاسک روسی کلیسا کے جبرو تشدد سے تنگ آ کر گھروں سے بے گھر ہوئے۔ تو انہیں بھی کہیں پناہ ملی تو آلِ عثمان کے دامن ہی میں ملی۔ سرٹھامس آرنلڈ کا یہ بیان حرف بہ حرف صحیح ہے کہ سنہ ہجری کے ابتدائی دورہ میں اسلام نے غیر مسلموں سے جو رواداری جائز رکھی اکثر خلفا کے وقت میں وہ قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی وجہ صرف مسیحی سلطنتوں کی مسلمانوں سے آئے دن کی مخالفت اور مخاصمت تھی کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی غریب بھیڑیں مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کو مجروح کرنے اور ٹھیس لگانے سے کبھی گریز نہ کرتیں۔ لیکن اس پر بھی مسلمانوں کی عدالتوں میں غیر مسلموں سے عدل و انصاف ہمیشہ ترازو کے تول کیا جاتا رہا۔ البتہ جو کہیں کہیں عیسائیوں پر سختی یا ظلم ہُوا بھی تو اس کی وجہ مقامی اثرات یا باہمی رنجشیں اور عناد تھا۔ لیکن مذہبی تعصب کہیں شمہ بھر بھی نہ تھا ÷

"ایشیائے کوچک" میں اگر کسی زمانے میں کچھ مذہبی تعصب پایا جاتا رہا تو اس کے ذمہ دار ترک ہرگز گردانے نہیں جا سکتے۔ کون ہے جو اس بات سے انکار

کر سکے کہ ترکوں کے آباؤ اجداد یعنی چنگیز خاں اور امیر تیمور جیسے جنگجو حکمران جو مغل بھی تھے اور تاتار بھی مذہبی تعصب سے پاک نہ تھے۔ اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ مغلوں اور تاتاروں کے بڑے بڑے "خان" اپنے غیر مذہب ہمسایوں کی سبھی تقریبوں میں شامل ہوتے تھے۔ اس حسن سلوک اور خیر سگالی کے جذبہ کی وجہ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ یہ لوگ اپنے غیر مذہب ہمسایوں سے ہمیشہ دوستی کا عہد وپیمان استوار رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے وہ مسلمان سلاطین جو نسلاً ترکی النسل تھے سولھویں صدی میں ان کی بلند نظری اور دوسروں سے رواداری ضرب المثل تھی۔ اور انہی میں اکبر اعظم تھا جس کی رگوں میں خالص ترکی خون تھا لیکن اس کی مذہبی رواداری اور آزاد خیالی کی یہ کیفیت تھی کہ پرتگال کے کلیسائی راہبوں کے پاس حضرت مریم کی تصویر دیکھ کر اتنا مرعوب ہوا کہ اکثر لوگوں کو اس کے عقیدے کے متعلق شک ہونے لگا ÷

وہی ترک جنھوں نے کبھی چین سے جنوبی روس تک اپنا سکہ جما رکھا تھا اوراقِ تاریخ ان کے کارناموں سے اسی طرح مزین نظر آتے ہیں جیسے اہل روما اور اہلِ انگلستان کے کارناموں سے۔ اہلِ روما کی طرح جن کی تہذیب کا کبھی ایک دُنیا میں ڈنکا بجتا تھا ترکوں کو بھی جہاں جہاں جہانبانی کا موقع ملا انہوں نے ماتحت قوموں کو وقتِ حاضر کی تعلیم اور تہذیب سے مالا مال کر دیا۔ اور ان کے لئے قوانین اور مناسب آئین جاری کئے اور بیرونی حملہ آوروں سے ان کی ہمیشہ حفاظت کی ÷

(۴)

مشرق میں معدنی پیداوار کے مسئلہ نے جو دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس تمام بحث سے ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ترکوں کو یہ حق تھا کہ وہ خلافت کے متعلق جو فیصلہ کریں اُسے دوسرے بلا چُون وچرا تسلیم کریں اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان انقرہ کے اس فیصلہ کو نظر تحسین سے دیکھنے لگے ہیں *

(۵)

اسلام کی تمام تعلیم اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں کسی کے لئے چُون وچرا کی گنجائش ہی نہیں۔ خواہ وہ عیسائی ہو یا یہودی مسٹر امیر علی نے اپنی مشہور کتاب "سپرٹ آف اسلام" (THE SPIRIT OF ISLAM) میں آٹھویں صدی میں آزاد خیال مسلمانوں کو قدامت پسند مسلمانوں کے مقابلہ میں جو زک اُٹھانی پڑی اس کے اسباب پر مفصل بحث کی ہے مسٹر امیر علی نے یہ بات صاف طور پر واضح کردی ہے کہ دسویں صدی (چار ہجری) خصوصیت سے ایشیا اور یورپ کے لئے مصائب کا زمانہ تھا۔ یورپ کے لئے یہ ایک دورِ ابتلا تھا اور شاید ہی کوئی ایسی قوم ہو جو ذاتی مقاصد کے لئے ایک دوسرے سے دست گریبان نہ ہو رہی ہو۔ ادھر ان ایشیائی ممالک میں جہاں مسلمانوں کی آبادیاں تھیں اور ان کے یہاں تہذیب کا دَور دَورہ بھی تھا بدقسمتی سے مذہبی اختلافات پیدا ہو رہے تھے یعنی قدامت پسند علماء اسلام کو ترقی پسند رہنمایانِ دین محمدی سے پیغمبر اسلام کی تعلیم کے بارے میں اختلاف تھا حقیقت شناس لوگوں کا یہ دعوےٰ بالکل درست تھا کہ ہادیٔ اسلام کی تعلیم ضرورت زمانہ کے مطابق ہے اور مدینۂ رسول کی درسگاہوں کے باعث اس خیال کے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی *

مسٹر امیر علی نے ان افسوسناک اختلافات پر بحث کرتے ہوئے دلیل و برہان سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اسلام کو انہی اختلافات کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا۔ اور علماء دین نے مسلمانوں کو من حیث القوم مشکلات میں ڈال دیا +

دسویں صدی سے چودھویں صدی عیسوی تک تمام بلند اور روشن خیال مسلمان آزاد مذہبی تعلیم کے حق میں تھے۔ اور تو اور خود امام غزالیؒ کا بھی یہی خیال تھا اور وہ مذہبی تعصّب رکھنے والوں سے ہمیشہ بیزاری کا اظہار کیا کرتے تھے۔ امام غزالیؒ کے مدنظر صرف ایک اصول تھا اور وہ اخوت اسلامی اور بنی نوع انسان میں محبت کا رشتہ استوار کرنا تھا اور آپ تمام عمر اسی اصول کی تعلیم فرماتے رہے اور مذہبی تنگ نظروں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ با ایں ہمہ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت اور تعجّب ہوتا ہے کہ اس مقتدر اور عالی مقام مبلغ اسلام نے مشرق کے لئے زمانہ حال کی سائنٹیفک (علمی) تعلیم کو ضروری نہ سمجھا یعنی وہی تعلیم جس کے مدّاحوں میں دوسرے آزاد خیال مسلمانوں کی طرح خود امام غزالی بھی شامل تھے +

مسلمانوں نے ایک زمانے میں ادبی نقطۂ خیال سے ایسی شاندار ترقی کی۔ کہ ایک دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور طبابت، حکمت، جغرافیہ، ریاضی، ہیئت کواکب اور فلسفہ کی نہریں بغداد۔ قرطبہ۔ بصرہ۔ دمشق اور قاہرہ سے نکل نکل کر ایک دُنیا کو سیراب کرنے لگیں +

مسٹر امیر علی نے عالم اسلام کی ان شہرہ آفاق ہستیوں کے جو مطلع اسلام پر تارے بن کر چمکیں نام بھی گنوائے ہیں۔ اور ان کے علمی کارناموں کا بڑے شاندار

الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کے ان کارناموں سے یورپ کا کوئی محقق انکار نہیں کر سکتا اور یار و اغیار دونوں کو ان کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑے ہی سال گزرے ہسپانیہ کے ایک بڑے کیتھولک عالم نے یہ تعجب خیز انکشاف کیا تھا۔ کہ اٹلی کے زندہ جاوید شاعر ڈینٹے کی شہرہ آفاق نظم جو "ڈیوائن کامیڈی آف ڈینٹے" کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں ہی سے مستعار لی گئی ہے۔

یہ کہتے ہوئے شرم اور ندامت دامن گیر ہونے لگتی ہے کہ کلیسا والوں نے اسلام کے متعلق من گھڑت مذہبی روایات عوام میں پھیلا پھیلا کر مسلمانوں کی ہمیشہ تکذیب کی ہے اور یہ ناپاک پراپیگنڈہ جسے اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں صدیوں تک اپنا زہریلا اثر پھیلاتا رہا ہے اور نہ صرف یورپ بلکہ ایران۔ عرب اور ہندوستان کے عیسائی مؤرخ بھی یہ بے سر و پا الزامات اس قوم پر لگاتے رہے ہیں جو اپنی فوجی جبروت۔ سیاسی قابلیت اور بنی نوع انسان سے عالمگیر ہمدردی کے جذبہ کی بدولت مدت تک ایشیا پر حکمران رہی اور لطف تو یہ ہے کہ خود مسٹر امیر علی کا دامن بھی اس الزام سے بری نظر نہیں آتا تو جب یگانوں کی یہ حالت ہو تو بیگانوں سے کیسا شکوہ۔ حضرت اقبال نے شاید ایسے ہی نامہربانوں کے لئے کہا تھا کہ ؎

گلۂ جفاء وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

موجودہ زمانے کا مؤرخ مسلمانوں کے تہذیبی تنزل کا الزام ترکوں کے سر تھوپتا

چاہتا ہے لیکن یہ محض غلط ہے۔ اسی طرح ترکوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مفتوح اقوام کے مغربی تہذیب اور تمدن سے آشنا ہونے میں رکاوٹیں ڈالا کرتے تھے بالکل جھوٹ ہے۔ ترکوں نے کبھی اس قسم کی تنگ نظری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے زیرنگیں ملکوں کا اخلاقی کیریکٹر بلند کرنے کی کوشش سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ تعجب ہے کہ دنیا یہ کیسے بھول گئی کہ یہ وہی ترک ہیں جنہوں نے چین میں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ ہندوستان میں جہانبانی کی اور ایشیا کے اکثر علاقے ان کے زیرنگیں رہے اور ہر جگہ حق اور انصاف کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ ایک مؤرخ کا ان حقائق سے غمازی کرنا بہت بڑا جرم ہے ہاں اگر یہ ہیں سے کوئی ترکوں پر یہ طعن کرے کہ ان لوگوں میں "جدت" کا مادہ نہیں تو پھر حق تو یہ ہے کہ یورپ کی اکثر اقوام کو بھی جن کا آج دنیا میں طوطی بول رہا ہے بغلیں ہی جھانکنی پڑیں گی۔ قدرت نے مختلف اقوام کو مختلف کام سپرد کئے ہیں اور اگر بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ترکوں اور اہل روما میں کچھ تمیز نہیں ہو سکتی۔ ایک ترک اور رومی کا ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے کہ وہ دنیا میں بساطِ سیاست کا مردِ میدان بننے کو پیدا کیا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کی یہ دونوں ممتاز قومیں فنونِ لطیفہ کو محض تفریح کا شغل سمجھتی رہی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو قومیں جہانبانی کے لئے پیدا کی جاتی ہیں وہ اپنا قیمتی وقت تفریحی باتوں میں ضائع نہیں کرتیں۔

جس طرح رومی اور یونانی مصریوں کے خوشہ چیں رہے اسی طرح ترکوں نے بھی ایرانیوں۔ عربوں اور اہلِ چین کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے جہانبانی کا سبق سیکھا اور نہ مانے نے انہیں ہندوستانی اور فرانسیسی معاشرت سے

بہرہ اندوز ہونے کا بھی موقع دیا۔ اور اہلِ روما کی طرح جس مُلک کی جہانبانی ان
کے حصّے میں آئی۔ انہوں نے اس مُلک کے رہنے والوں کو ایک منضبط آئین سے
فیض یاب کیا اور مُلک کا نظم و نسق کر کے اہلِ مُلک کو فلاح اور بہبود کے راستہ
پر ڈال کر ایک باعزت زندگی بسر کرنے کا گر سکھایا۔ یورپ اور ایشیا میں
اخوت کا رشتہ بھی ترکوں کی کوششوں سے قائم ہوا اور انہی لوگوں کی بدولت
یورپ والے عروس تہذیب سے ہم کنار ہوئے۔ اس عروس کا نام اسلامی تہذیب
تھا جو سب سے پہلے ایشیا کے مطلع پر تاباں ہوئی ٭

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت ترکوں کو سب سے زیادہ
علم و ادب کی ضرورت ہے وہ لوگ جو دل میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مسلمان اقوام
میں سے صرف ترک ہی ایک ایسی قوم ہے جو کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتی تو یہ محض
اغیار کی اُڑائی ہوئی باتیں ہیں یہ لوگ متواتر دو سو سال سے اس قسم کا غلط پراپیگنڈا
محض اپنا اُلّو سیدھا کرنے کو ترکوں کے خلاف کئے چلے آرہے ہیں اور یہ آس
لگائے بیٹھے ہیں کہ اگر ان کا یہ جادو کبھی چل گیا تو شاید کسی روز ترکی پر ان کی
سیادت قائم ہو جائے۔ حالانکہ حقیقت میں مسلمان اقوام میں ترک ہی ایک ایسی
قوم ہے جس میں ہر نئی تحریک سے فائدہ اُٹھانے کی بدرجہ اتم صلاحیت ہے یہ جو
ایک مدّت سے یورپ والوں نے ترکی میں اصلاحات کا ڈھونگ رچا رکھا
ہے تو یہ بھی ان لوگوں کی ایک سیاسی چال کے سوا اور کچھ بھی نہیں حالانکہ ان
لوگوں کے ہاں اصلاحات کی حقیقت بقول حکیمِ ملّت حضرت اقبالؒ اس سے

زیادہ کچھ بھی نہیں کہ ؎

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایت و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

لیکن کوئی نکتہ چینیوں سے اتنا تو پوچھے کہ تم نے کبھی ترکوں کو اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کا موقع بھی دیا۔ کبھی انہیں اطمینان سے بیٹھنے بھی دیا۔ وہ قوم کس طرح کوئی اصلاحی کام سرانجام دے سکتی ہے جس کے ہر کام پر نکتہ چینی کی جائے۔ اور قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی جائیں۔ اسی طرح ترکوں پر مذہبی تعصّب کا جو آئے دن الزام لگایا جاتا ہے شروع شروع میں تو یہ بازنطینی حکومت کی کرشمہ سازی تھی اور اب اہل یورپ کی ایک سیاسی چال ہے جو پہلے سے زیادہ شدومد سے جاری ہے حالانکہ اس حقیقت سے کوئی اہلِ نظر انکار نہیں کرسکتا کہ من حیث القوم ترک بہت بردبار اور عالی حوصلہ لوگ ہیں مسلمانوں کو اسلام نے سختی اور جبر کی اجازت صرف اس موقع پر دی ہے جب غیر مسلموں کی سرکشی اور فتنہ پروری کو دبانے کی اور کوئی صورت باقی نہ رہے اور اگر بسدِ رمق یہ مذہبی تعصب کہیں نظر بھی آیا ہے تو اس کے ذمہ دار ترک نہیں قرار دیئے جاسکتے بلکہ تاریخ کے اوراق پر جو ہمیں کہیں کہیں خون کے چھینٹے نظر آتے ہیں تو یہ سب غیر مسلم اقوام کے خانگی۔ سیاسی اور معاشرتی اختلافات کی کرشمہ سازی ہے۔ غریب ترکوں کو دوش دینا انصاف کا خون کرنا ہے ۔

---

(۶)

اب آئیے ہم تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں یعنی وہ رُخ جس کی طرف آج سب کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ اسلام کی ابتدا تو مکّہ سے ہوئی لیکن جب مکّہ میں مسلمانوں کے لئے خدا کا نام لینا دشوار ہو گیا تو اسلام کا مرکز مدینہ بنا۔ اور یہاں تھوڑے ہی دنوں میں اس پر پولیٹیکل رنگ بھی چھا گیا اور وقت کے تقاضا نے ہر مسلمان کو ایک مردِ مجاہد بنا دیا اور جب ان مجاہدینِ اسلام نے دُنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا دیا اور دُنیا میں مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہو گئیں تو اسلام اپنوں کی طرح بیگانوں کے لئے بھی سراپا برکت و رحمت بن گیا اور اسلامی مساوات اور خیر و برکت کا پیغام دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا۔ اور یہی خدا کا حکم تھا۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ایک دوسرے سے جُدا جُدا مت رہو اور خدا کے احسان کو یاد کرو۔
پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں
اُلفت ڈالی اور اب تم اس کے فضل سے ایک دوسرے کے بھائی
بن گئے۔"

لیکن افسوس ہے کہ جہانبانی کی اُلجھنوں میں پھنس کر مسلمان اس فرمانِ الٰہی کو بھول بیٹھے اور مسلمان حکمرانوں نے مذہب کو ضرورتِ وقت کے سانچے میں ڈھال لیا۔ عباسیوں کے عہدِ حکومت میں تو اس کی شکل و صورت ہی بدل گئی۔ آخر کار وہ وقت بھی آیا جب انہی ترکوں نے اس نام نہاد خلافت کا نقشہ ہی بدل

ڈالا جسے اسلام سے دُور کی نسبت بھی نہ تھی ٭

ترکوں نے جو کام ہاتھ میں لیا ہے یعنی مسلمانانِ عالم کی تنظیم وہ ہر طرح اس کے اہل ہیں لیکن ان حالات میں جب کہ اسلام کو "مُلاتوں" کے پنجہ سے ابھی ابھی نجات ملی ہے اس کام کے لئے ابھی وقت درکار ہے۔ ترک اب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ خوابِ غفلت میں پڑے رہنے کے کیسے بُرے نتائج ہوتے ہیں ٭

اوراقِ تاریخ شاہد ہیں کہ جتنے مصائب سے ترکوں کو دوچار ہونا پڑا اگر کوئی اور قوم ہوتی تو جانے اس وقت اس کا کیا حشر ہوتا۔ یہ "ترکِ خرگاہی" ہی تھا کہ کٹھن سے کٹھن امتحان میں بھی پورا اُترا اور آج کوئی طاقت اس کے پائے ثبات کو ڈگمگا نہیں سکتی کوئی قوت اس کے عزمِ راسخ کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ اس کی خودداری کا جذبہ کبھی دب کر نہیں رہ سکتا اور قوم اور وطن کی خاطر وہ کسی ایثار سے باز نہیں رہ سکتا ۔ ترکوں کی ساری تاریخ اسی قسم کے زرین کارناموں سے مزین ہے بقول حضرت علامہ اقبالؒ ے

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ان خوبیوں کے علاوہ ترکوں میں ایک وصف اور بھی ہے جو یورپ میں نپولین کے بعد بالکل مفقود ہو گیا تھا یعنی اپنے رہنما کی اندھی تقلید۔ نپولین جب سینٹ ہلینا میں نظر بند تھا تو اُس نے ایک موقع پر کہا تھا "کاش! یورپ کے سپاہیوں کے بجائے میں ترکوں کا سردار ہوتا" ٭

اس نے ترکوں کو بھی اجتماعی۔ مالی۔ اقتصادی۔ زراعتی اور عدل و انصاف کے شعبوں کی تنظیم کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنے ہاں کی پیداوار کو اور زیادہ فروغ دینے کی تجاویز پر بھی غور و فکر کر رہے ہیں اور یہی وہ کام ہیں جن کی طرف انگورہ کے سیاست دان اور ترکی کے قومی رہنما اپنی تمام تر توجہ مبذول کر رہے ہیں ؛

اناطولیہ کے سادہ لوح کسان "علم الٰہی" کے نقطوں کو بھلا کیا سمجھیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت کا اگر مطالعہ کرنا ہو۔ ان کی فطرت کو اگر سمجھنا ہو تو مصطفےٰ کمال پاشا کی طرف دیکھئے اور ذرا اس سے پہلے وقتوں کی تاریخ پر نظر ڈال لیئے اور دو مختلف ملکوں کے سیاسی راہنماؤں زوشسکی اور کوسوتھ کی زندگیوں اور زندگی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیجئے اور ان ملکوں کی قسمت کا اندازہ لگائیے جن کی رہنمائی کی باگ ان دونوں کے ہاتھ میں تھی۔ زوشسکی کی پشت پر پولینڈ کے دہقان تھے اور کوسوتھ کے مددگار ہنگری کے زراعت پیشہ لوگ تھے اور ان لوگوں کو دُنیا کے اہم بین الاقوامی سیاسی مسائل سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا تاہم اپنے سیاسی لیڈروں کی غلط روش کا شکار ہو کر ان سیاسی مشکلات میں مبتلا ہونا پڑا جن سے وہ ان لیڈروں کی موجودگی سے پہلے کبھی دوچار نہ ہوئے تھے غازی مصطفےٰ کمال جس نے تاریخ عالم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور جس کے وطن ترکی نے جہاں تک آزادی کا سوال ہے آج وہی صورت اختیار کر رکھی ہے جو ۱۷۷۶ء میں انقلاب امریکہ نے اختیار کر لی تھی۔ اور پولینڈ اور ہنگری کے ہنگامی رہنماؤں "زوشسکی" اور "کوسوتھ" کے نظریہ کو نظر انداز کر کے ملکی اور قومی آزادی کے لئے صرف واشنگٹن کی پالیسی پر عمل پیرا ہے چنانچہ جب انقرہ کی "گرینڈ اسمبلی" (مجلس اعلیٰ) نے اتاترک کو خلافت پیش کی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ "خلافت"

بھی تو نظام جمہوری کا ایک جزو ہی ہے ؛

انقرہ کی "گرینڈ اسمبلی" یعنی مجلس اعلیٰ نے یہ فیصلہ کر کے کہ ترکی شاہی خاندان کو ملک سے نکال دیا جائے پھر ایکبار وہی قدیمی مسئلہ پیدا کر دیا جو روزِ اول سے مسلمانانِ عالم کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ ۱۹۱۹ئہ میں جبکہ مٹھی بھر ترکوں نے جب جنگِ آزادی شروع کی اور جس روز یونانی افواج سمرنا پر آتریں مسلمانوں میں ایک آگ بھڑک اُٹھی ادھر جب ترکوں کے خانگی اختلافات سے فائدہ اُٹھا کر دولِ عظام نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اور مقامات مقدسہ پر بھی غیر اقوام کے پرچم لہرانے لگے تو ان واقعات نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ اور سب سے پہلے بلقان میں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور آخر ترکوں کی بھی آنکھ کھلی اور اُنہوں نے سمجھ لیا کہ سلاطین یورپ تو انہیں بیخ و بنیاد سے ہی نکال باہر کرنے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسلمانوں کے بگڑے حالات دیکھ کر ناممکن تھا کہ مسلمانانِ ہندوستان متاثر نہ ہوتے۔ آخر ان کی رگِ حمیت بھی جوش میں آئی۔ اور ہندوستان سے مولانا محمد علی مرحوم اور سید وزیر حسن مسلمانانِ ہندوستان کے نمائندوں کی حیثیت سے اس غرض سے یورپ گئے کہ سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ انگلستان سے تبادلہ خیالات کریں اور پارلیمنٹ کو اس کی غلطی پر متنبہ کریں۔ دسمبر ۱۹۱۲ئہ میں مولانا محمد علی جب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے پہلی بار لندن آئے تو اس مقام کو جہاں ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی گئی تھی ترکی پرچم سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور دارالعوام اور دارالامرا کے معزز اراکین نے بڑی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا اس موقع پر مولانا نے تقریر کرتے ہوئے اہلِ یورپ اور خصوصیت سے اہلِ انگلستان

پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ مسلمانانِ ہندوستان "درمے۔ قدمے۔ سخنے" ترکوں کا ساتھ دیں گے اور جو سلطنت ترکوں کی دشمن ہوگی تمام عالمِ اسلام اس قوم کا دشمن ہوگا ؎

اور یہ نظارہ بھی کتنا مؤثر ہوگا۔ جب آنریبل ایوبرے ہربرٹ ممبر پارلیمنٹ کی صدارت میں ہندوستانی مسلمانوں کے ان نمائندوں کے اعزاز میں دعوت دی گئی تو انہوں نے کھانا شروع کرنے سے پیشتر ہاتھ اُٹھا کر درگاہِ ایزدی میں خلافت کے استحکام اور اقبال کے لئے دعا مانگی ؎

اکثر مؤرخوں نے ہندوستان کے مسلمانوں اور دولتِ برطانیہ کے تعلقات پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ سب کے سب اس بات کے معترف ہیں کہ مسلمان انگریزوں سے ہر موقع پر تعاون کرتے رہے ہیں۔ اور لارڈ بیکن فیلڈ جس نے ہندوستان کو تاجِ برطانیہ سے وابستہ کر دیا تھا ہمیشہ مسلمانوں کو سلطنت برطانیہ کا طاقت ور جزو سمجھتا رہا۔ انگلستان میں (مولانا) محمد علی مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں جو تقریر کی اس سے انگریزوں کے کان بھی کھڑے ہوئے۔ ادھر قسطنطنیہ اور بمبئی میں ایک عالمگیر اسلامی اتحاد سے بھی ان کی آنکھیں کھلیں اور شاید اپنی غلطی کا بھی کچھ احساس ہوا ہو لیکن تاریخ کے مطالعہ کا شوق رکھنے والوں کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ یہ وہی مسلمان تھے جنہوں نے اپنے خلیفہ (سلطان ٹرکی) کے حکم سے قبرس کی شورش فرو کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ گو یہ واقعہ سیاسی نقطۂ نظر سے کچھ ایسا اہم نہ ہو لیکن اس سے اتنا تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کی ایوانِ خلافت سے کہاں تک عقیدت تھی۔ اور وہ خلیفۃ المسلمین کے ہر حکم پر کتنی مستعدی سے لبیک کہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ؎

سنہ ۱۹۲۰ء میں محمد علی اس مقصد کے لئے پھر ایک بار یورپ گئے اور اس موقع پر آپ نے پوپ سے بھی شرف ملاقات حاصل کیا اور عیسائیوں کے اس پیش امام نے مسٹر لائڈ جارج سے کہیں بڑھ چڑھ کر آپ کی آؤ بھگت کی اور آپ کی بات توجہ سے سُنی چنانچہ مولانا موصوف نے اس موقع پر بھی مسلمانان ہندوستان کو ترکوں سے جو ہمدردی اور خلافت سے جو عقیدت تھی صاف صاف الفاظ میں واضح کردی ؛

لیکن انقرہ کی "گرینڈ اسمبلی" نے جب بیک جنبش قلم خاندان عثمان کو ملک سے جلاوطن کر دیا۔ تو دُنیا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی مسلمانان ہندوستان کو ترکوں کی اس حرکت سے بہت صدمہ ہوا۔ اور اُنہوں نے وائسرائے ہند پر زور ڈال کر مسٹر مانٹیگو کے نام جو اس وقت وزیر ہند تھے اس مضمون کا تار دلوا دیا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے خلافت کے برقرار رکھے جانے کے لئے آواز بلند کریں اور ترکوں کے اس فعل سے بیزاری کا اظہار کریں ؛

اس کے دو سال بعد جب ترکوں نے اس خلافت کا جو گذشتہ چھ سو سال سے مسلمانان عالم کی توجہ اور احترام کا مرکز بنی ہوئی تھی جھگڑا ہی مٹا دیا اور دول یورپ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر قسطنطنیہ پر سیاسی قبضہ کر لیا۔ تو اس نازک دور میں مسلمانوں کی عام خاموشی ان سب کے لئے ایک معمہ تھی گو وہ دل میں یہ آس بھی شاید لگائے بیٹھے ہوں کہ کوئی وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکیں گے۔ لیکن وہ لوگ جو ابھی تک خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں مشرق کے فلسفی شاعر علامہ سر اقبال کا یہ پیغام بھی سن لینا چاہئے کہ ؎

تا خلافت کی بنا دُنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر

اہلِ یورپ نے صدیوں سے مشرق میں پیروانِ مسیح علیہ السلام کی جیسے جیسے حمایت اور طرفداری کی ہے وہ بھی کسی کو بھُولی نہیں اور ترکوں کے راستے میں جس جس طرح کانٹے بوئے گئے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ تنگ نظر ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ اسلام بنی نوع انسان کی مادی ترقی میں سد راہ ہوتا ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک اس مادی اور سائنس کی ترقی کا تعلق ہے۔ ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے ترک اس قسم کی علمی ترقی کے اہل ہی نہیں اور ان سے اس قسم کی کوئی توقع رکھنا سعی لاحاصل ہے۔ اس غلط خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے یورپ کے مسیحی حکمرانوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ جہاں جہاں بھی اسلامی مقبوضات ہیں ان پر عیسائیوں کی سیادت رہے ان حکمرانوں میں سے جو دوسروں کی نسبت کچھ آزاد خیال کتھے وہ ترکوں کو مذہبی نقطہ خیال سے تو کچھ زیادہ موردِ الزام نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ دیکھنا انہیں بھی گوارا نہیں کہ ترک من حیث القوم کسی ملک پر حکمرانی کریں اور یورپ کو ترکوں سے جو کاوش صدیوں سے چلی آتی ہے اس کی تہ میں یہی نکتہ مضمر ہے لیکن غالباً ان کوتاہ بینوں کو یہ معلوم نہیں کہ ؎

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رُسوائی تدبیر دیکھ

کلیسا کے ہوا خواہ اور مسٹر لائیڈ جارج ترکوں کے خلاف جو زہر آج تک اُگلتے رہے ہیں یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ وہ لوگ جو اہلِ مشرق کی فطرت کو سمجھتے ہیں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لیوانٹ میں جو غیر مذاہب والوں کا کشت و خون ہُوا اس کا تمام تر الزام ترکوں کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ کیونکہ اس کشت و خون میں وہاں کے عیسائیوں کا بھی کچھ کم ہاتھ نہ تھا اور پھر اس قسم کے فسادات میں یہ تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں - اوراق تاریخ میں اس قسم کی خون آشامی کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مشرق میں بھی اچھے یا بُرے واقعات اپنا رنگ لاتے رہتے ہیں لیکن مذہبی اور فرقہ وارانہ چپقلشوں کی کسی نے آج تک ایسی تاریخ نہیں لکھی جس میں حق و انصاف کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور جو مذہبی رنگ آمیزی سے پاک ہو ؛

ایک چشم بینا خود دیکھ سکتی ہے کہ مشرق اور مغرب میں اس قدر منافرت پھیلنے کا اصلی باعث کیا ہے سب سے پیش پیش تو دونوں براعظموں کے یہی مذہبی رہنما ہی ہیں اور ان کے بعد وہ اقتصادی اور مالی مفاد پر مرمٹنے والے بھیڑ کے روپ میں خونخوار بھیڑیئے ہیں جو بظاہر بگلا بھگت بنے ہر چیز اُچک لے جانے کی تاک میں رہتے ہیں - مذہبی رہنما تو جن کا آج کل مشرق میں طوطی بول رہا ہے - محض من گھڑت روایات اور مذہبی افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے مشرق کے مسلمانوں کے سامنے خلافت کو جس رنگ میں پیش کیا ہے جناب رسول عربی صلعم کی مقدس تعلیم کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام کے دورِ اوّل میں مذہبی آزادی اور دینی امور میں اختلاف کا رُونما ہونا ایک مفید بات متصور ہوتی تھی۔ آج مسیحی دُنیا کو ترکوں کی طرف سے اسی صورت میں اطمینان ہو سکتا ہے جب مشرق میں ان کی کسی جگہ آباد

حکومت نہ رہے۔" خلافت کا برطرف کر دینا حکومت جمہوری اور ملکی اصلاحات کا پیش خیمہ ہے لیکن اس کا دَور اُس وقت شروع ہوگا جب مشرق میں امن قائم ہوگا لیکن جب پیروانِ اسلام خود ہی اسلام کی رسمِ کہن کو آئین نو پر قربان کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں تو پھر دیگر اقوام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بھی غیر جانبدار رہیں اور کوئی شخص ترکوں کے نئے نظام کی تعمیر میں مخل نہ ہو۔ آخر ترک بھی تو جہانبانی کے رموز سے واقف ہی ہیں :

انقرہ کی "گرینڈ اسمبلی" جو ترکی کی سب پرانی انجمنوں کی ایک نئی تنظیم ہے مانا کہ نئی روشنی کی دلدادہ ہے لیکن سلطنت کی ترقی کی تمام راہیں اس جگہ ختم نہیں ہو جاتیں۔ حقیقت میں یہی نئی تنظیم ایک انقلاب ہے جسے ہم "**انقلابِ اسلام**" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابھی تو ہم اس کی ابتدا ہی دیکھ رہے ہیں جب ابتدا اس قدر خوشگوار ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ انجام کیسا شاندار ہوگا اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی یقین رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ "انقلاب اسلام" اسلام کی صحیح تعلیم کے ہرگز خلاف نہ ہوگا :

ممکن ہے کہ پرانے خیال کے مسلمان ترکوں کو موردِ الزام گردانیں لیکن وہ ذرا معاہدہ سیورز (TREATY OF SEVRES) کی ان دو شرائط پر بھی ایک نظر ڈالیں جو ترکی کے شاہی خاندان نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیں اور ان پر اپنی مُہر ثبت کر دی تھی۔ وہ دو شرائط یہ تھیں :-

۱۔ ترک ان تمام مسلمانوں کی سیادت سے دست بردار ہوتے ہیں۔ جو

غیر اقوام کے ماتحت آباد ہوں یا جن کی ریاستوں پر غیر اقوام والوں کو سیادت حاصل ہے ÷

۲- وہ علاقے جو ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ ترکوں کا اب ان پر کوئی حق نہیں اور ان علاقوں میں جس قدر مسلمان آباد ہیں۔ ترک ان سے تعرض نہ کریں گے۔

کس قدر تعجّب اور حیرت کا مقام ہے کہ شاہی خاندان میں سے کسی کو بھی اس کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت نہ ہوئی اور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جب قوم اور ملک کی خدمت کا وقت آیا تو شاہی خاندان ہیں سے کسی نے بھی ترکی کی قومی فوج کے لئے اپنی خدمات پیش نہ کیں اور نہ ہی کسی نے حکومت انقرہ کا ساتھ دیا۔ یہ صرف غازی مصطفےٰ کمال پاشا ہی کی ہمت تھی کہ اس نے معاہدہ لوزان (TREATY OF LAUSANNE) کے وقت ان دونوں تحقیر آمیز شرائط کو منسوخ کرا دیا ÷

اسلام کے بیشمار زرین اصولوں میں ایک اصول "اجتماع" بھی ہے یعنی ہر بات میں کثرت رائے پر عمل کیا جائے۔ اسلام جب تک اس اصول پر کاربند رہا ہمیشہ فائدہ میں رہا۔ "اصول اجتماع" بھی عین قرآن اور پیغمبر اسلام صلعم کی تعلیم ہے مسلمان اگر اس زرین اصول کو ہر معاملہ میں پیش نظر رکھتے تو کبھی گھاٹے میں نہ رہتے۔ اسلام نے خلافت کا فیصلہ بھی کثرت رائے پر اُٹھا رکھا ہے یعنی خلافت کے لئے اُسے منتخب کرو۔ جس کے حق میں تمہاری کثرت رائے ہو اور جس میں خلافت کا بار اُٹھانے کی صلاحیت بھی ہو ÷

آج صرف ایشیا ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں "لیڈر شپ" یا سرداری ممتاز نظر آتی ہے کیونکہ یہاں قائد کو من جانب اللہ سمجھا جاتا ہے ؀

ترک اگر ایک بار کسی کو اپنا رہنما مان لے تو اس کے حکم کی تعمیل اس کا جزو ایمان بن جاتا ہے اور یہ ایک ایسا بڑا وصف ہے جس سے فائدہ اُٹھا کر اہلِ یورپ ایشیا میں بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے بشرطیکہ انہیں ترکوں سے اتحاد کرنے کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ؀

ترکوں کا "خلافت" کے متعلق یہ خیال ہے کہ تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے سے اسے ایک نئے آئین کے ماتحت از سر نو قائم کیا جائے۔ رہا شاہی خاندان کا اخراج تو یہ تو محض ایک تاریخی واقعہ ہے جو ایک سیاسی ضرورت کے ماتحت عمل میں لایا گیا۔ اور بجائے اس کے کہ مسلمان خواہ مخواہ ترکوں کے خلاف مشتعل ہوں۔ انہیں ٹھنڈے دل سے ان قومی نقائص کے ردِ عمل پر غور کرنا چاہیئے جس کے ذمہ دار فاضل علماء الہیات ہیں۔ تعجب ہے کہ دُنیا بدل گئی لیکن یہ لوگ نہیں بدلے ؀

مصطفےٰ کمال پاشا جو قومی تحریک کا بانی ہے۔ دُنیا اور اُس کی قوم اس کے شاندار کارنامے کبھی بھول نہیں سکتی۔ یہ اسی کے دم قدم کی برکت ہے کہ ہم یورپ میں ترکوں کی ایک سلطنت ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔ یورپ نے تو اس اسلامی سلطنت کو مٹا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا لیکن اتاترک نے ہمت اور حوصلہ سے اسے پھر ایک بار منظم کر دکھایا ہے اور ابھی جو پروگرام اس نے مسلمانان عالم کے لئے تجویز کر رکھا ہے اگر مسلمانوں نے اس پر عمل کیا تو شاید وہ روز روشن بھی کبھی نظر آجائے کہ مسلمان دُنیا میں عزت اور آبرو سے رہ سکیں مسلمانوں کے راستے میں یہ

علما الٰہیات ایک سنگ گراں ہیں نہ تو انہیں اسلامی سیاسیات سے کچھ دلچسپی ہے اور نہ انہیں مسلمانوں کے مصائب کی کچھ خبر ہے اور نہ یہ لوگ اسلام کے ان ضروری مسائل کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت سمجھتے ہیں لیکن یہ فرقہ پرست گروہ جن کا گذشتہ زمانے میں طوطی بولتا رہا اب مسلمانوں کو اس بات سے نہیں روک سکتے کہ وہ زمانے کی ضروریات کے مطابق اپنے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔ اسلام تو خود بنی نوع انسان کو آزادی کی تعلیم دیتا ہے اور دوسروں پر جبر و تشدد کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ جو مسلمان خدا کو واحد ماننے والا ہو وہ دوسروں کا کیسے دست نگر رہ سکتا ہے"

دیکھنا یہ ہے کہ ترک کیا چاہتے ہیں وہ بھی تو مسلمانوں کو اپنے نبی صلعم کی تعلیم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"پس تمہیں اللہ ہی کی پرستش کرنی ہے اور ان لوگوں کی فرماں برداری جو تمہاری ہدایت اور رہبری کے لئے بھیجے گئے ہیں۔"

اسلام میں مسلمانوں کے خلیفہ کو محض اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کہ دنیا میں وہ اُن کا مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے اور خلیفہ کے فرائض میں سب سے بڑا فرض بھی یہی ہے کہ وہ اسلام کی حفاظت کے لئے روئے زمین کے مسلمانوں کو اجتماع کا حکم دے مسلمانوں پر عدل و انصاف سے حکومت کرے اور اسلام کے مقدس مقامات کی حفاظت کرے۔

انقرہ کی گرینڈ اسمبلی نے بھی جو اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت منصوبہ ہو رہی ہے اور ترکی کی حکومت جمہوری کا نظام اسی کے سپرد ہے یہ اعلان کیا

ہے کہ مسلمانوں سے عدل و انصاف کیا جائے گا ؛

صاف ظاہر ہے کہ "خلافت" کی دو شرطیں تو اس طور پر پوری ہو گئیں یعنی ایک تو یہ "گرینڈ اسمبلی" مسلمانوں کے مشورہ سے قائم کی گئی ہے اور یہی اس وقت بر سر اقتدار ہے اور ملک کا نظم و نسق بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے اس "اسمبلی" نے عدل و انصاف کا اعلان کر کے دوسری شرط بھی پوری کر دی ہے ؛

اب رہا مسلمانوں کو مذہب کی حفاظت کے لئے اجتماع کا حکم دینا اور اسلام کے مقدس مقامات کی نگہبانی تو ترک یا ان کی گرینڈ اسمبلی اس کا یقین دلانے کے لئے ابھی تیار نہیں یعنی اگر وہ اس بات کا ابھی سے اعلان کر دے کہ حسین پاشا والیٔ حجاز نے ترکوں کے دشمنوں سے مل کر جو نقصان مسلمانوں کو پہنچایا ہے وہ اس کی تلافی کی کوشش کریں گے تو یہ محض مسلمانوں کو دھوکا دینے کے مترادف ہو گا۔ ترک تو سب سے پہلے اپنی تمام تر توجہ اپنی حالت کو سنوارنے حکومت کو مستحکم کرنے اور اپنی قوم کو دور حاضر کی علمی تعلیم سے آراستہ کرنے کی طرف مبذول کریں گے جب تک حکومت مستحکم نہ ہو جائے۔ دوسرا کوئی کام نہیں ہو سکتا ؛

غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے یکم مارچ کو جو تقریر کی تھی۔ اس میں یہ اشارہ بھی کر دیا تھا کہ خلافت کا کام بھی ترکی کی یہی جمہوری سلطنت سر انجام دے گی اور ترکی عساکر کا یہ فرض ہو گا کہ اس جمہوری حکومت کی حفاظت کے لئے ہمیشہ سینہ سپر ہیں ؛

اسی طرح اب عامۃ المسلمین کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک ایسے مسئلے کے لئے آپس میں لڑیں جھگڑیں جو فی الحال اُن کی دسترس سے باہر

ہے ۔ انہیں اپنی قومی تنظیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے ؛

خلافت کے بارے میں ترکوں کو معتوب کرنے سے پیشتر اور آپس میں اُلجھنے سے پہلے مسلمانوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ یہ اختلاف رائے کہیں کوئی اور روز بد نہ دکھائے ۔ جب پیغمبر اسلام صلعم نے بھی کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ ان سے غلطی ہونی ناممکن ہے تو پھر مسلمانوں کا اپنے کسی مقتدر رہنما کے متعلق یہ یقین کر لینا کہ وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا کس قدر مضحکہ خیز ہے ؛

لیکن اس کی بھی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ہم اسلام کے اس بہادر اور مقتدر رہنما کے اس نظریہ پر غور و فکر نہ کریں ۔ جو اس نے خلافت کے متعلق دُنیاء اسلام کے سامنے پیش کیا ہے ۔ اسی طرح اس کی بھی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ ہم علماء اسلام کی رائے کو مصطفےٰ کمال پاشا کی رائے پر ترجیح دیں جس نے گذشتہ پانچ سالوں میں اسلام کی عظمت کو ہر طرح برقرار رکھا ہے ۔ حقیقت میں مصطفےٰ کمال پاشا انقرہ کی گرینڈ اسمبلی اور اناطولیہ کے کسانوں ہی کے سر مسلمانوں کی عزت کا سہرا ہے ۔ انقرہ کے سیاست دانوں اور جمہوریہ ترکی پر نکتہ چینی کرنے والے کیا جانیں ۔ وہ تو لندن اور یورپ میں بیٹھے مزے اُڑا رہے ہیں ۔ ان پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ ع ” کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا “ ؛

سچ تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو اپنے ان کلمہ گو بھائیوں کے قول و فعل پر نکتہ چینی کرنے کا کیا حق ہے جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنا جان و مال قربان کر دیا ہے اور فی زمانہ ترک ہی اس بات کے اہل ہیں کہ وہ اسلام کی ظاہری اور باطنی خوبیاں دُنیا

کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو بتلا سکیں کہ اسلام کا اصلی مفہوم کیا ہے اِسوقت ایک دُنیا کی آنکھیں اسلام کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ہر شخص آئندہ دس پندرہ سال میں عالمِ اسلام میں رُونما ہونے والے انقلابات کے لئے چشم براہ ہے۔ اور اگر ترکوں کو اپنا تعمیری پروگرام کا موقع مل گیا تو پھر وہ دن بھی دُور نہیں جب دنیا پھر ایک بار ہاشمی شان وشوکت کے خوبصورت مناظر دیکھ سکیگی۔ مغربی اور وسطی ایشیا۔ ہندوستان کا بہت سا حصہ۔ شمالی اور وسطی افریقہ ان سب ممالک میں ابھی تک اسلام کی رُوحانی سیادت قائم ہے۔ اسلام اس وقت جس دَور میں گزر رہا ہے اس کی مشکلات اور وقت کی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو کوئی ایسا قائد مل جائے۔ جو قوم کی کمزوریوں کو سمجھتا بھی ہو اور ان کا علاج بھی کر سکے اور دُنیا جس ڈگر پر چل رہی ہے اس کا بھی اُسے صحیح اندازہ ہو۔ ان اوصاف کا رہنما ہی قوم کو ترقی کے راستے پر ڈال سکتا ہے اور مشرق کی اقتصادی مشکلات کا حل اہلِ مشرق کو سمجھا سکتا ہے ؀

اگر آج ترک اور ان کا بہادر اور ماہر سیاست قائد غازی مصطفےٰ کمال پاشا یہ ذمہ داری اُٹھانے کے لئے تیار ہو اور جناب رسول ہاشمی کی تعلیم کے مطابق عدل و انصاف اور حکمرانی کرنے کا یقین قوم کو دلا سکے تو پھر مسلمان کا فرض ہے کہ قوم کی تعمیر کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائے ؀

اقوامِ مشرق کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا والے ایک ایسے رہنما کی ہدایات پر دل وجان سے کاربند ہو جاتے ہیں جس رہنما کا قول اور فعل ایک ہو اور وہ قوم کا دُکھ درد بانٹنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے آج غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے تدبّر۔ بہادری۔ عزم اور استقلال سے اپنی قوم کے دل میں گھر کر لیا ہے۔

اسلئے اہلِ مغرب کا بھی اب یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ غازی موصوف کے کاموں میں مین میخ نکالنے کی عادت سے گریز کریں اور انہیں اطمینان سے اپنی قوم کی تعمیر کا کام کرنے دیں ؛

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے ہٹ دھرم سیاست دان ترکوں کے خلاف ایک ناپاک پراپیگنڈا پھیلانے میں کسی وقت نہیں چوکتے گویا اُنہوں نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ غریب ترکوں کو محض اسلئے کہ وہ مسلمان ہیں کبھی سُکھ کا سانس نہیں لینے دیں گے اور اگر مسلمانانِ عالم جنہیں خلافت سے ایک والہانہ عشق معلوم ہوتا ہے ۔ انقرہ کی گرینڈ اسمبلی کو مسلمانوں کی آئینی منتظمہ جماعت تسلیم کریں اور اُس کے فیصلوں پر صاد کریں تو عالم اسلام کی بہت سی مشکلات کا انسداد ہو جائے اور بہت سے متنازعہ مسائل خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں ؛

وہ قوم جو ایشیا والوں کی ترقی ۔ فلاح اور بہبود کی سچے دل سے کوشش کرے گی وہی اقوام عالم میں توازن اور بنی نوع انسان میں اخوت اور ہمدردی پھیلا سکے گی اور یہی اسلام اور دیگر مذاہب کی تعلیم ہے ؛

مصر

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدّت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

(اقبالؒ)

مارچ ۱۹۱۹ء میں انقلاب مصر کے بعد حکومت برطانیہ نے جو ایک وفد مصر بھیجا تھا لارڈ ملنر نے اپنی رپورٹ میں یہ قابل غور الفاظ بھی لکھے تھے :-

"سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے دیانت داری کے ساتھ مسئلہ مصر پر آج تک غور نہیں کیا اور اس وقت جو حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ سب ہماری غفلت کا نتیجہ ہے" ؛

(۱)

مصر کے مسئلہ پر ہمیں دو پہلوؤں سے غور کرنا چاہئے۔ ایک تو وہی جو برطانوی سیاست دانوں کا تمام مشرق کے متعلق نقطہ نظر رہا ہے یعنی دنیا کے نقشہ پر فوجی نقطہ نگاہ سے نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ رود بار نیل سے سیراب ہونے والی وادی سلطنت برطانیہ کے فوجی تحفظ کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتی ہے اور نہر سویز کو جو تین براعظموں اور دو سمندروں کو ایک دوسرے سے ملحق کرتی ہے تجارتی پہلو سے جو اہمیت دی جا رہی ہے کہاں تک صحیح ہے ؛

یہ امر واقعہ ہے کہ مصر فوجی نقطۂ نگاہ سے اور نہر سویز تجارتی پہلو سے سلطنت برطانیہ کے لئے اس قدر اہم ہے کہ کوئی صاحب نظر انگریز اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ وادی نیل پر انگریزوں کے سوا کسی اور ملک کی سیادت قائم ہو ؛

دوسرا پہلو جس پر ہمیں غور کرنا ہے وہ یہاں کے باشندے ہیں جو سلطنت کے تجارتی راستوں پر آباد ہیں ؛

وادی نیل کے رہنے والے رسم و رواج کے لحاظ سے اہلِ فرنگ سے مختلف ہوں تو ہوں لیکن ان دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون موجزن ہے اور اگر مصر کے یہ ڈیڑھ کروڑ باشندے ہمیں تہذیب نو سے آراستہ ہونے کے مشتاق نظر آئیں۔ اور اپنے ملک کو زمانہ حال کے اقتصادی اور علمی اصولوں سے بہرہ اندوز دیکھنے کے متمنی ہوں اور دل و جان سے اس کے لئے کوشاں بھی ہوں اور انہیں یہ اُمید بھی ہو کہ یورپ ان کی دستگیری بھی کرے گا اور ان کے مغربی ہمسائے بھی انہیں اپنے ملک کے اصلاحی پروگرام کو مکمل کرنے میں مدد بھی دیں گے تو پھر اس سے زیادہ بنی نوع انسان کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے جو اس پروگرام بنانے والی قوم کی مدد سے گریز کرے کیونکہ حقیقت میں یہی وہ مدد یا خیر سگالی کا جذبہ ہے جس سے مشرق اور مغرب کے اختلافات مٹ سکتے ہیں ؛

(۲)

مصر کا مسئلہ حقیقت میں اس بین الاقوامی مسئلہ کی ایک کڑی ہے جس نے

ایک دُنیا کو اس وقت اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے اور جس کے خوشگوار حل پر یورپ اور خصوصیت سے انگلستان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ آج جو ہم مشرق اور مغرب کی ہر بات میں ایک اختلاف دیکھتے ہیں تو ہمیں کسی حکیم کا یہ نظریہ تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق رہے گا اور مغرب مغرب! یعنی دونوں میں اتفاق ہونے کی فی الحال کوئی صورت نہیں اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب نے مشرق کی طرف صدق دل سے دوستی کا ہاتھ کبھی نہیں بڑھایا یعنی بقول شاعر؎

کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم کھچے کھچے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

۱۹۱۴ء تک مصر چونکہ سلطنت ترکی کا ایک صوبہ متصور ہوتا تھا۔ اس لئے اسے صرف فوجی اہمیت ہی حاصل نہ تھی بلکہ مشرق اور مغرب کے متنازعہ مسئلہ کے حل میں بھی اسے کچھ نہ کچھ اہمیت حاصل تھی ہمیں اس بحث سے واسطہ نہیں کہ محمد علی پاشا نے جو سلطان المعظم کی طرف سے مصر کا پہلا وائسرائے تھا۔ وادی نیل پر کس طرح تسلط جمایا۔ اور کس طرح اس مُلک میں اہلِ یورپ خاص کر فرانسیسیوں کی مدد سے مدارس جاری کئے۔ رفاہ عام کے محکمے کھولے۔ آبپاشی کے وسائل قائم کئے اور مصر کے باشندوں کو مغربی علوم سے آراستہ کر کے دیگر قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا؛

لیکن رُوس اور انگلستان کی محمد علی پاشا سے آویزش کا سب سے بڑا باعث یہ تھا کہ خدیو (حکمرانِ مصر) فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں کٹ پُتلی بنا ہوا تھا۔ اور

یورپ کی وجہ مخاصمت یہ تھی کہ مصر مشرق کی دیگر اسلامی حکومتوں کے ساتھ مل کر خلافت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ رہا زار! تو زار کو اسلامی حکومتوں کا اتحاد اور تنظیم اس لئے پسند نہ تھی کہ ایک مدت سے اس کی ترکی پر نظر تھی اور دربار انگلستان محض اس خوف سے دربار روس کے دوش بدوش عمل پیرا تھا کہ اس کے نقطۂ نظر سے محمد علی پاشا خدیو مصر جیسا مدبر اور صاحب تدبیر آدمی ترکی سلطانوں کی طرح موم کی ناک ثابت نہ ہو گا ؂

لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ دانایانِ فرنگ پھر ایک بار چوکڑی بھول لے۔ محمد علی پاشا جب دول عظام کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ تو اس نے فرانس سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور دربار انگلستان ۱۹۱۴ء کی طرح آج بھی مشرق کے دیرینہ دشمن روس کا ہم خیال تھا جس طرح ۱۹۰۸ء میں ترکوں کو یورپ کی دیگر سلطنتوں سے مایوس ہو کر جرمنی کا دامن پکڑنا پڑا۔ اسی طرح ۱۸۳۹ء میں مصری انقلاب پسندوں کو فرانس کے سوا اور کوئی ہمدرد اور ہم خیال نظر نہ آیا ؂

جب مصری افواج ابراہیم پاشا خلف محمد علی پاشا کی سرکردگی میں ترکی کی دیوار دل تک جا پہنچیں تو دول عظام نے انہیں اسی جگہ روک دیا۔ اور محمد علی کو مجبوراً مصر کی نظامت پر قانع رہنا پڑا گو کچھ روز بعد سوڈان بھی مصر کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ؂

۱۵ جولائی سنہ ۱۸۴۰ء میں "کنونشن آف لندن" اور یکم جون ۱۸۴۱ء کے سلطانی فرمان نے ٹرکی اور مصر کے تعلقات کا فیصلہ کر دیا۔ یعنی مصر پر سلطان اعظم کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔ لیکن خلافت کو مصر پر جو سیادت ملی اس کے لئے وہ زمانہ

کی حکومت کی احسانمند تھی لیکن بعد میں زار کی یہی دوستی ترکوں کو بہت مہنگی پڑی۔ محمد علی پاشا کو اگر موقع دیا جاتا تو وہ مشرق کے مسلمانوں کو منظم کرکے ایک سلک میں پرو دیتا۔ لیکن مغربی ہمسایوں کی رقابتوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ تاہم یہ اُسی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ کہ ایک مدت بعد اہلِ مشرق کو ہوش آہی گیا اور اس قسم کے کارناموں نے خدیو کا نام تاریخ میں روشن کردیا ÷

(۳)

برطانوی دخل درمعقولات سے بہت پہلے اہلِ مصر ترقی کی منزل کی طرف گام زن تھے۔ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی فضول خرچیاں جنہوں نے ملک کو تقریباً دیوالیہ بنا دیا تھا۔ ان اقتصادی ترقیوں کے سامنے ہیچ ہیں جو ۸۲-۱۸۴۰ء کے درمیان وادی نیل میں رونما ہوئیں مثلاً ملک کو نہروں سے سیراب کرنے کی عظیم الشان سکیم۔ مصری ریلوے۔ ہسپتال۔ محکمہ حفظانِ صحت۔ خوشنما سڑکیں اور خوبصورت باغات۔ چڑیا گھر۔ مغربی طرز کے مدارس اور علمی درسگاہیں۔ یہ سب کام اس وقت ظہور میں آئے جب مصر والے اپنے ملک کے بلاشرکت غیرے مالک تھے۔ یعنی جب حکومت مصر خود مختار تھی کیونکہ سلطان المعظم نے کبھی مصر کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیا تھا۔ اسی طرح قاہرہ کے قریب دریائے نیل پر بند۔ زراعت کو ترقی دینے کے وسائل اور ایسے ہی بے شمار چھوٹے چھوٹے اصلاحی کاموں سے صاف عیاں ہے کہ مصریوں کو کہاں تک اپنے ملک کی اقتصادی حالت سنوارنے کا خیال تھا ÷

لیکن برطانوی بیڑے کے امیرالبحر سیمور کی اسکندریہ پر اچانک گولہ باری

کرنے اور جنرل ولزلی کی قیادت میں انگریزی افواج کے مصر میں داخل ہونے سے دُنیا حیرت میں آگئی۔ ان فوجی اقدامات کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ خدیو کی فضول خرچیوں سے ملک میں جو بدامنی پھیلی ہوئی ہے اسے فرو کرنے کے لئے فوجی کارروائی ضروری تھی۔ یہ محض ایک بہانہ ہی تھا کیونکہ عربی پاشا کی بغاوت سے پہلے ہی مصر کے مالیات فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھے اور اسمٰعیل پاشا کی فضول خرچیوں کا اب کوئی سوال ہی نہ تھا۔ عربی پاشا کی بغاوت کی اصلی وجہ سے تاریخ نے ابھی تک چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے لیکن اس بغاوت کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ مصری طلبا نے (جن میں سعد افندی زاغلول جو بعد میں تاریخ اقوام میں غازی زاغلول پاشا کے نام سے مشہور ہوئے شامل تھے) اپنے ہم وطنوں کا اعتماد حاصل کر کے اہلِ مصر کے لئے حکومت سے پارلیمنٹری حقوق حاصل کر لئے۔ یعنی دُوسرے الفاظ میں خدیو کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا گیا اور جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی گئی +

لیکن انگریزوں کی مداخلت سے یہ تمام تحریک ناکام ہوگئی گو جنرل ولزلی نے ستمبر ۱۸۸۲ء میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ مصر میں محض خدیو کے شاہی حقوق کو از سرِ نو بحال کرنے کے لئے آیا ہے اور جب ملک میں امن ہو جائے گا تو برطانوی سپاہ واپس چلی جائے گی لیکن یہ سب ہاتھی کے دانت تھے کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ کیونکہ اس روز سے آج تک دربارِ انگلستان تین اوپر ستّر بار اسی قسم کے اعلان کر چکا ہے اور دُنیا کو یقین دلاتا رہا ہے۔ کہ انگریزوں کو مصر اور حکومت مصر سے کچھ سروکار نہیں اور الحاق مصر کا تو کبھی بھُولے سے بھی دربارِ انگلستان کو

خیال نہیں آیا۔ اور اس اعلان کرنے والوں میں مسٹر گلیڈسٹون۔ لارڈ سالسبری۔ لارڈ روزبری۔ لارڈ ڈفرن۔ سر ولیم ہارکورٹ اور جوزف چیمبرلین جیسے سیاستدان بھی شامل تھے یعنی انگلستان کی سیاست کے درخشندہ ستارے لیکن حقیقت میں انگریزوں کو نہ تو ۱۸۸۲ء کی تحریک سے کچھ سروکار تھا نہ خدیو کی حکومت سے کچھ مطلب۔ بلکہ ان کی نگاہیں تو "نہر سویز" کی طرف لگی ہوئی تھیں جس کی تعمیر کا مسئلہ اس وقت زیر تجویز تھا ؂

نہر سویز کی تعمیر کے متعلق لارڈ پامرسٹن کی مخالفت کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اس سے اسے ہندوستان پر فرانس کی زد پڑتی نظر آتی تھی۔ اور بحر اوقیانوس میں برطانوی اثر کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا ؂

۱۸۵۴ء میں ایک یورپی ٹھیکیدار کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف نہر سویز کا جب خدیو نے اجارہ دے دیا تو دربار انگلستان نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ کس طرح سلطان المعظم اس اجارہ کو منظور نہ کریں۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء تک اس کے متعلق گفت و شنید ہوتی رہی لیکن آخر سلطان نے بھی منظوری دے دی۔ انگریزوں کی جب یہ چال ناکام رہی تو ۱۸۷۵ء میں لارڈ بیکن فیلڈ نے راک فیلڈ کو نہر سویز کی کمپنی کے ۸۵۵۰۶ حصے جو خدیو کی ملکیت تھے خریدنے پر آمادہ کر لیا چنانچہ یہ ۸۵۵۰۶ خدیو کے حصص اور ۱۷۶۶۰۲ حصص جو انگریزوں نے پہلے خریدے تھے۔ اس ترکیب سے چار لاکھ حصوں میں سے ۲۶۲۱۰۸ حصص انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ اِدھر لارڈ بیکن فیلڈ نے ایک پُرلطف پیرایہ میں

یہ بیان بھی دے دیا کہ خدیو نے محض اپنا فرض ادا کرنے کے لئے مجبوراً انگریزوں کے ہاتھ اپنے حصّے فروخت کر ڈالے ہیں۔ انگریزوں کی چال سے غریب فرانس مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ اور لارڈ ڈربی نے جو اس وقت انگلستان کا وزیر خارجہ تھا۔ یہ تجویز پیش کی کہ نہر سویز کی تعمیر کے کام میں وہ سب حکومتیں شامل ہوں جن کی سمندروں پر سیادت ہے۔ قصّہ مختصر انگریزوں کی ان تمام چالوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ حکومت برطانیہ نہر سویز کی تعمیر کا اجارہ کسی غیر قوم کے ہاتھ میں دیکھنا گوارا نہ کر سکتی تھی ؂

اس طرح دربار انگلستان کو سویز کنال کے معاملہ میں کامل اطمینان ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۷۷-۷۸ء میں ترکی اور رُوس کی جنگ کے موقع پر انگریزوں نے نہر سویز کو رُوسی بحری بیڑے کی ہر ممکن مداخلت سے محفوظ رکھا اور لارڈ ڈربی نے دربار روس کو ایک مراسلت بھیج کر صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ اگر روس نے نہر سویز کو بند کر دیا۔ تو دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی ہندوستان پر بھی نظر ہے اور دُنیا کی تجارتی منڈیوں کو بھی وہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے ؂

عزبی پاشا نے جب خدیو کے خلاف بغاوت کی تو اطالیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ بین الاقوامی طور پر اس مسئلہ کو سلجھایا جائے۔ ترکوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ لیکن دول عظام کا آپس میں سمجھوتہ نہ ہو سکا اور جب فرانس نے

مصر پر فوجی دباؤ ڈالنے کی تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ تو سر گارنٹ ولزلی نے انگریزی افواج سرزمین مصر پر اُتار دیں اور آج یہاں پڑاؤ ڈالے انہیں بیالس سال گزر چکے ہیں۔ اور نہ جانے یہ فوجی اقتدار آگے چل کر کیا کیا گُل کھلاتا ہے:

انگلستان کے بحری جنگی بیڑے کے کمانڈر ایڈمرل سیمور نے سکندریہ کے کمانڈر کے نام جو اعلان بھیجا اور پھر خلیج ابوکیر میں انگریزی جنگی جہازوں کا داخلہ اور حکومت مصر کا اس کے خلاف احتجاج! ہمیں ان باتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ ہاں اس میں کچھ کلام نہیں کہ حکومت برطانیہ کے پاس مصر میں فوج بھیجنے کی کوئی معقول دلیل نہ تھی اور دُنیا کی نگاہ میں بھی دربارِ انگلستان کی یہ چال بہت قابل اعتراض تھی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس ؛

ایک طرف تو اس گتھی کو سلجھانے کے لئے تھرے پیا (THERAPIA) میں ۲۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو ایک کانفرنس ہو رہی تھی اور ادھر انگریزی بیڑا اسکندریہ پر گولہ باری کر رہا تھا حالانکہ ۱۸۷۹ء میں ایک بین الاقوامی قانون نہر سویز کی حفاظت کے لئے مرتب کیا جا چکا تھا۔ لیکن یہ سب قوانین بالائے طاق ہی رکھے رہ گئے۔ اور باوجود چیخ و پکار کے اہل مصر کو اس جبر و تشدد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور بتدریج یورپ کی دیگر حکومتیں بھی خاموش ہو گئیں اور انگریزی فوجیں مصر میں ڈٹی رہی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو روزِ اوّل سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اہل مشرق دوسروں کی دستگیری کے بغیر کبھی ترقی نہیں کر سکتے ان کے نقطۂ نظر سے مصر پر انگریزی قبضہ اہل مصر کے لئے باعث برکت تھا۔ یورپ کے پیش نظر سب سے پہلے اس کے تجارتی مفاد

ہوتے ہیں اور انگریزوں کی حکمت عملی سے انہیں کسی قسم کا تجارتی نقصان پہنچنے کا چونکہ کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس لئے انہیں بھی شکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔ آخرکار ان سب باتوں کا نتیجہ جو ہونا ناگزیر تھا۔ وہی ہوا یعنی مصریوں کی گردن میں انگریز کی غلامی کا جوا پڑنا تھا پڑ ہی گیا۔

مصریوں میں اعتماد حاصل کرنے کے لئے برطانوی سیاست دانوں کی یہ شاطرانہ چال بڑی ہی کامیاب رہی کہ انگریز جتنے نئے قوانین نافذ کرتے سب مصری وزرا کے ناموں سے جاری کئے جاتے۔ حالانکہ اخلاقی پہلو سے یہ چال سخت قابل اعتراض اور غیر منصفانہ تھی۔ کیونکہ وہ اہل مشرق جو صدیوں سے اپنے قدیمی رسمی رواج پر چلتے تھے اور پرانے آئین کے پابند تھے انہیں مغرب کے آمرانہ قوانین سے لادا جا رہا تھا۔ جس کا دوسرے الفاظ میں صرف یہ مطلب تھا کہ مشرق کو سیاسی۔ اخلاقی اور معاشرتی پہلو سے اقوام مغرب کی نگاہ میں رسوا کر دیا جائے اور لوگوں کو بتا دیا جائے۔ کہ اس قسم کے "ممدہ پوشوں" سے کسی قسم کی اصلاح کی امید رکھنا محض خام خیالی ہے یعنی وہی تنگ نظروں کا دیرینہ حربہ جو وہ مشرقی اقوام کے خلاف مدت سے استعمال کر رہے تھے۔ وہ واقعات جو بعد میں رونما ہوئے ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ چال واقعی بڑی کامیاب ہوئی اور آخر اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ گو مصر کی مالی ساخت خاصی سدھر چکی تھی۔ غیر ملکی قرضہ باقساط ادا ہو رہا تھا۔ تاہم سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے کام میں انگریزوں کے اندھا دھند دخل دینے اور ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرانے سے مصری دنیا کی نگاہ میں اپنا سب قومی وقار کھو بیٹھے اور مصری

آبادی کا وہ طبقہ جو "افندی" (معزز طبقہ کے لوگ) کہلاتا تھا انگریزی عہدہ داروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا اور جنہیں چشم بینا عطا ہوئی تھی وہ سمجھ گئے کہ بقول علامہ اقبال ؂

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

اس کے ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد مصریوں کے قومی قائد مصطفےٰ کامل نے اہلِ مصر میں قومی بیداری کا جذبہ از سرِ نو بیدار کر دیا۔

مصری کاشتکار جس طرح آج سے چھ ہزار سال پہلے اپنے حکمرانوں کے آگے سر جھکاتا تھا آج پھر حکومت برطانیہ کے عہدہ داروں کے سامنے اسی غلامانہ ذہنیت کا اظہار کرنے لگا اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے انگریزی حکام بھی دل میں یہی سمجھنے لگے کہ اب ان لوگوں کو جو ناچ چاہیں گے نچوائیں گے!

---

(۵)

چنانچہ سب سے پہلے اس خیال یا اعتماد نے عملی صورت جنگ عظیم کے موقع پر اختیار کی جب مصر والوں نے نہ صرف اپنے دیرینہ تعلقات سلطان المعظم سے ہی منقطع کر لئے بلکہ ترکوں کے خلاف انگریزوں کی امداد بھی کی۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مصر کی پروٹیکٹریٹ کا اعلان کر دیا گیا اور فوجی خدمات کے لئے ایک "لیبر کور"

تیار کی گئی جس میں دس لاکھ سے زائد مصریوں نے نام لکھوا دیئے۔ انگریزوں کی طرف سے اس لیبر کور سے عمدہ سلوک اور معقول تنخواہ کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن وہ وعدہ کبھی پورا نہ ہؤا چنانچہ لارڈ ملنر نے اپنی رپورٹ میں اس لیبر کور کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ دورانِ جنگ میں اس سے اچھا سلوک نہیں کیا گیا اور جو وعدہ ان سے کیا گیا تھا کہ انہیں لڑنے والوں کی صفوں کے عقب میں رکھا جائے گا۔ بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔

اس قسم کے اور واقعات سے مصریوں کے صبر کا پیمانہ آخر لبریز ہو گیا چنانچہ وہ ایسی ذلت اور تحقیر زیادہ برداشت نہ کر سکے جیسا کہ لارڈ ملنر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

"مصری لیبر کور سے جو وعدہ خلافی کی گئی تھی اور دورانِ جنگ میں ان سے جو سختی کی گئی اس سے اہلِ مصر بہت برانگیختہ ہوئے اور ان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے کدورت آ گئی"۔

اس وقت زاغلول پاشا جسے ایک مصری کسان کا فرزند ہونے پر ہمیشہ فخر رہا مصر کے سیاسی مطلع پر نمودار ہؤا۔ اور اہلِ مصر نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ زاغلول نے پورے پانچ برس اپنے ملک کی جو شاندار خدمات کیں۔ ان کے عوض میں اس کے اہلِ وطن نے اسے سلطنت مصر کا وزیر اعظم بنا دیا۔ ملک میں جو ایک قومی تحریک فروغ پا رہی تھی انگلستان کی رائے عامہ اس سے قطعاً بےخبر تھی اور محض غلط فہمی کی بنا پر زاغلول پاشا کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا اور اس کے اثر کو ضعف

پہنچانے کے لئے یہ غیر مآل اندیشانہ چال چلی کہ اسے علانیہ شورش پسند اور سلطنت برطانیہ کا دشمن قرار دے کر غدار اور مصر کے خلاف سازباز کرنے والا مشہور کر دیا۔

کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ وہی زاغلول پاشا جس نے چالیس سال تک حکومت مصر کی خدمت کی۔ کبھی مصر کی عدالتِ عالیہ کا مشیر بھی رہا۔ پھر وزیر عدالت اور وزیر تعلیم کے عہدوں پر بھی فائز ہوا۔ جس کے فہم و فراست کا مداح لارڈ کرومر جیسا مشہور سیاست دان بھی ہو۔ جس نے چالیس سال کی عمر میں غیر فانی قانونی شہرت حاصل کی ہو اور مصریوں کو اس کی رہنمائی اور قیادت پر مکمل اعتماد بھی ہو اسی زاغلول پاشا کو ملک کا دشمن اور حکومت کا مخالف قرار دے کر محض جرم حب الوطنی کی پاداش میں جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ زاغلول پاشا جیسا محب وطن بطن گیتی سے کبھی کبھی ہی پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان کے ارباب حل و عقد کی یہ تنگ نظری بھی انگلستان کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بن کر ہمیشہ چمکا کرے گی۔

---

(۶)

اگر کوئی پوچھے کہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں انگریزوں نے جو مصر کو برطانیہ کی ایک پروٹیکٹریٹ بنا لیا تو مصری کیوں خاموش رہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ پروٹیکٹریٹ کے اعلان کے بعد بادشاہ انگلستان نے خدیو مصر کو یہ یقین دلایا تھا کہ یورپ میں صلح ہو جانے کے بعد اہل مصر کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا اور مناسب وقت پر مصر کی خود مختاری کے مسئلہ پر ہمدردانہ غور کیا

جائے گا؛

اسی طرح برطانوی افواج مقیم مصر کے کمانڈر انچیف جنرل میکسول نے اپنے فوجی اعلان میں شاہی وعدے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ

"اہلِ مصر کے جو حقوق محمد علی پاشا خدیو مصر کے مدنظر تھے آج برطانیہ انہی حقوق کے لئے جنگ کر رہی ہے۔"

چنانچہ عارضی صلح کے بعد یعنی نومبر ۱۹۱۸ء کو زاغلول پاشا جو اس وقت مصر کی مجلس شوریٰ کے نائب صدر تھے اپنے دو رفقا کے ساتھ مصر کے ہائی کمشنر سر ریگنلڈ ونگیٹ کے پاس گئے اور ۱۹۱۴ء کے شاہی وعدہ کے ایفا کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے لندن جانے کا پاسپورٹ مانگا۔ لارڈ ملنر نے اس واقعہ کا اپنی رپورٹ میں بدیں الفاظ ذکر کیا ہے۔

"۱۳ر نومبر ۱۹۱۸ء کو زاغلول پاشا اور نیشنل پارٹی کے دو اور لیڈر مصر کے ہائی کمشنر کے پاس اس غرض سے لندن جانے کا پاسپورٹ مانگنے گئے کہ شاہی وعدے کے بارے میں وزرائے انگلستان سے گفت وشنید کریں۔

اسی طرح مصر کے وزیر اعظم رشدی پاشا نے بھی خدیو مصر کی اجازت سے ہائی کمشنر سے ملاقات کی اور اپنی کیبنٹ کے دو اور وزیروں کے ساتھ انگلستان جا کر مصر کے پروٹیکٹریٹ بن جانے کے بعد اہلِ مصر کے حقوق کے متعلق حکومت برطانیہ سے گفت وشنید کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور پاسپورٹ طلب کیا لیکن مصر کے ہائی کمشنر نے

جب اپنی گورنمنٹ سے ان دونوں سیاسی لیڈروں کے ولایت آنے
کے بارے میں استصواب کیا تو وہاں کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے
یہ جواب ملا کہ اس وقت مصر کے قومی رہنماؤں کا لندن آنا محض بیکار
ہوگا اور اس طرح حکومتِ مصر کے نمائندوں کے لئے بھی انگلستان آنے
کے لئے یہ موزوں موقع نہیں کیونکہ وزیر خارجہ اور دیگر وزرائے
انگلستان صلح کی کونسل میں شرکت کرنے کے لئے انگلستان سے باہر
ہونگے اور مصری معاملات کے متعلق زیادہ وقت نہ دے سکیں گے۔
یہ کورا جواب پاکر رشدی پاشا نے استعفیٰ دے دیا۔ گو ہائی کمشنر نے
اپنے طور پر مصری لیڈروں کے ولایت جانے کے متعلق مزید کوشش
کی لیکن برطانیہ کی وزارتِ خارجہ کے سامنے اس کی بھی کچھ پیش نہ گئی"۔

یہ تو رہا لارڈ ملز کا بیان! لیکن دیکھنا یہ ہے کہ زاغلول پاشا جیسے مقتدر قومی
لیڈر اور حکومتِ مصر کے وزیر اعظم سے جس کے ملک نے دورانِ جنگ سلطنتِ برطانیہ
کی ایسی شاندار خدمات کیں کہ برطانوی سپہ سالار لارڈ ایلنبائی کو یہ اعلان کرنا پڑا۔
کہ اگر ۱۹۱۸ء میں مصر برطانیہ کا ساتھ نہ دیتا تو مشرق میں انگلستان کو فتح
نصیب نہ ہوتی۔ دربارِ انگلستان کا یہ سلوک کہاں تک جائز تھا اور ۱۹۲۱ء
تک برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کا معاملاتِ مصر سے پہلوتہی کرتے رہنا
کتنی کورچشمی تھی ؟

مصر کی پہلی قومی انجمن جسے "وفد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ہائی کمشنر مصر

کی خط و کتابت سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ زاغلول پاشا کی پالیسی کس قدر معتدل اور صلح کل تھی۔ جب زاغلول پاشا اور اس کی جماعت کے بارہ اور اراکین نے خدیو مصر کے حضور میں ۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو اس مطلب کی ایک درخواست گذاری کہ انہیں یورپ جا کر اہل مصر کے مطالبات کے اظہار کی اجازت دی جائے۔ ادھر جب مصر کے ہائی کمشنر سر میلن چلینھم کو اس درخواست کا علم ہؤا تو اس نے فوراً اپنی گورنمنٹ کے مشورے سے زاغلول پاشا اور اس کے تین رفقاء کار کو مصر سے جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ۱۲ مارچ کو ملک میں فساد ہو گیا اور ۱۴ مارچ سے ۲۰ مارچ تک مصر کے اور شہر بھی اس شورش میں شامل ہو گئے اور ہر جگہ انگریزی سپاہ اور انگریزی حکام پر حملہ کیا جانے لگا۔ اور اکثر مقامات پر کچھ برطانوی عہدہ دار مارے بھی گئے اور تار اور ریلوے کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور ۱۸ مارچ کو اس فساد نے اور بھی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ لیکن ۲۶ مارچ کو برطانوی فوج کی مدد سے پھر حالات پر قابو پا لیا گیا۔ لارڈ ملز ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں رقمطراز ہے:۔

> "اس طرح زاغلول پاشا اور اس کے رفیقوں کو جلاوطن کرنے کے تھوڑے ہی روز بعد انگریزوں اور دیگر مغربی اقوام کے خلاف ایک ایسی تحریک رونما ہوئی جس نے جلد ہی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ یہ ایک خالص قومی تحریک تھی اور تمام ملک اس میں شامل تھا۔"

اور ان تمام واقعات کا ذمہ دار برطانیہ کا وزیر خارجہ لارڈ کرزن تھا جس نے مصر کے قومی رہنماؤں سے ولایت میں گفت و شنید کرنے سے انکار کر کے

اہلِ مصر کے جذبات کو ٹھیس لگائی ۔

خیر! یہ ہنگامہ حسب دستور فوجی جبر و تشدد سے فرو کر دیا گیا اور کچھ روز بعد زاغلول پاشا اور اس کے ہمراہیوں کو بھی وطن آنے کی اجازت دے دی گئی اور آخر لارڈ ایلنبائی نے جو اس وقت مصر کا ہائی کمشنر تھا۔ زاغلول کو یورپ جانے کا پاسپورٹ دے دیا لیکن اس موقع پر لارڈ کرزن نے پھر یہ اعتراض اُٹھایا کہ زاغلول پاشا مصر کا نمائندہ ہرگز نہیں یعنی مصر کے معزز طبقہ کو زاغلول کے وفد سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ مصر کا معزز طبقہ موجودہ پروٹیکٹریٹ سے بالکل مطمئن ہے چنانچہ اس کے جواب میں اہلِ مصر اور حکومت کے عہدہ داروں نے پروٹسٹ (احتجاج) کے طور پر تین دن ہڑتال رکھی اور لارڈ کرزن پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ مصری من حیث القوم زاغلول کے ساتھ ہیں اور اسے اپنا رہنما اور قائد متصوّر کرتے ہیں لیکن کتنا افسوس ہے کہ لارڈ کرزن نے باوجود مشرقی معاملات پر کافی عبور رکھنے کے اہلِ مصر کی توقعات اور خواہشات کو ہمیشہ ٹھکرا دیا اور یورپ کے دیوِ استبداد نے بتلا دیا کہ مشرق اہلِ مغرب کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا یعنی بقول حضرت اقبالؒ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

---

(۷)

۱۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کو نیشنل ڈیلیگیشن کے مشورے سے زاغلول پاشا نے

اہلِ مصر کے جو مطالبات انجمن اقوام عالم کے سامنے پیش کئے تاریخی نقطہ نظر سے اُنہیں وہی اہمیت حاصل ہے جو انقرہ کے "نیشنل پیکٹ" کو جس کی رُو سے ترکی قوم کی تنظیم ہوئی۔ حاصل تھی۔ مطالبات یہ تھے :۔

۱۔ مصر اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی خود مختاری تسلیم کر لی جائے کہ

(ا) اہلِ مصر نے اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن سے ممکن قربانی دی ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۸۴۰-۱۸۴۱ء میں مصر اس بات کا اہل تھا کہ اپنی قوت بازو سے اپنا یہ حق تسلیم کرا سکے لیکن دول عظام نے زور ڈال کر اسے ایک ایسی گورنمنٹ منظور کرنے پر مجبور کر دیا جو ایک نقطہ نظر سے چھوٹے پیمانہ پر خود مختار حکومت متصوّر ہو سکتی تھی ؛

(ب) مصر ترکی سیادت سے آزاد ہو چکا ہے۔

(ج) ملک کی مالی۔ اقتصادی اور معاشرتی حالت اس قدر سدھر چکی ہے۔ کہ اسے اب اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنا انصاف سے بعید ہے ؛

۲۔ مصر ایک ایسی گورنمنٹ کا مطالبہ کرتا ہے جو اپنی مُلکی ضروریات کے مطابق قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر ملک کے لئے آئین بنائے اور اس کے ساتھ یہ بھی وعدہ کرتا ہے کہ قانونی۔ اقتصادی اور معاشری اصلاحات رائج کرنے کے لئے مغرب کے ماہران سیاست سے مشورہ لیتا رہے گا۔

۳۔ مصر اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ غیر اقوام جو مصر میں آباد ہیں ان کے حقوق کی پوری پوری نگہداشت کی جائے گی اور اگر تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ غیر ملکیوں کو مصر میں جو مراعات حاصل ہیں ان میں مزید اصلاح ہو سکتی ہے تو پھر اہلِ مصر فیاضانہ

طور پر اس مسئلہ پر بھی غور کریں گے اور ایسی تجاویز اختیار کریں گے جس سے نہ تو ملکی مفاد کو نقصان پہنچے اور نہ ہی غیر اقوام خسارے میں رہیں ۔

۴۔ مصر اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ ملک کی مالی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی اور ملک کے قومی قرضے کی ادائگی کے لئے ۱۹۰۴ء کی تجاویز سے بہتر تجاویز پر عمل کیا جائے گا ۔

۵۔ دول عظام نہر سویز کی غیر جانبداری کے متعلق جو فیصلہ کریں مصر اسے تسلیم کرے گا ۔

۶۔ مصر کو اگر حکومت خود مختاری عطا کر دی جائے تو وہ لیگ آف نیشنز کے نظام کے ماتحت دیگر قوموں کے دوش بدوش اپنے ملک کو عدل و انصاف سے بہرہ یاب کرنا اپنے لئے باعث فخر تصوّر کرے گا ۔

(دستخط) سعد زاغلول

ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں زاغلول پاشا نے اپنے اہلِ وطن کے جذبات اور تاثرات دنیا کے سامنے جن موزوں الفاظ میں پیش کرنے کی جراٴت کی۔ اس میں کوئی غدارانہ یا مفسدانہ پالیسی مضمر تھی؟ اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کو یہ کہاں تک زیبا تھا کہ اُس نے بیک جنبش قلم اس درخواست کو مسترد کر دیا ۔

زاغلول پاشا نے کئی بار انگلستان جا کر اہل انگلستان سے مصری معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے پاسپورٹ مانگا لیکن اس کی درخواست حیلے بہانوں

سے ہمیشہ مسترد کر دی گئی ⁂

زاغلول پاشا کی جلاوطنی کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۲۹ء کو جاروی پاشا مرحوم نے جو اس وقت مصر کی لیجیسلیٹو اسمبلی کا نائب صدر تھا مصر کے ہائی کمشنر فیلڈ مارشل لارڈ ایلین بائی کو ایک خط لکھ کر لارڈ کرزن کے اس الزام کی پُر زور الفاظ میں تردید کی کہ مصر میں اہلِ انگلستان کے خلاف کوئی تحریک موجود ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ مصری وفد کے انگلستان جانے کی اصلی غرض یہ ہے کہ اہل انگلستان سے مصر کی خود مختاری کے لیئے اپیل کی جائے اور اُسے اس کے وعدہ کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اس خط میں پاشا مرحوم ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جب مصر کی پروٹیکٹریٹ کا اعلان کیا گیا تو اہل مصر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ ان کے وہ حقوق جو ترکوں نے تسلیم کئے تھے انگریزوں جیسی آزاد خیال قوم نے انہیں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ برطانوی عہدہ داروں کے طرزِ عمل نے اہل مصر کو اور بھی بدظن اور خائف کر دیا ہے کیونکہ ایک طرف تو حجاز۔ آرمینیا اور شام وغیرہ کا جو کل تک ترکوں کی باجگذار ریاستیں تھیں حق نیابت تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن مصر کو جو تہذیب۔ تمدن اور وقار کے لحاظ سے ان سب سے ممتاز ہے اور جسے ایک بین الاقوامی معاہدے کی رُو سے سیلف گورنمنٹ کا رُتبہ بھی حاصل ہے اور جس نے جنگِ عظیم کے موقع پر برطانیہ کی ہر ممکن امداد بھی کی۔ "مجلس صلح" میں شامل ہو کر اپنے حقوق کی نگہداشت کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ انگلستان جانے کے لئے اس کے وفد کو پاسپورٹ دیا جاتا ہے"۔

"اس بے انصافی کا قدرتی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ملک کے طول و بلد میں حکومت برطانیہ کی روش کے خلاف غم اور غصّے کی ایک لہر دوڑ جاتی۔"

اسی خط میں پاشا مرحوم نے ان واقعات پر بحث کرتے ہوئے جو زاغلول پاشا کی جلاوطنی کی وجہ سے ظہور میں آئے اور مصر کی تین سو معزز خواتین کے ایک وفد کا ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے زاغلول پاشا کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی تھی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے :۔

"ہم یوئر ایکسیلنسی (لارڈ ایلن بائی) کو اس بات کا یقین دلا سکتے ہیں کہ ملک میں جو آج بد اعتمادی اور نفرت پھیل رہی ہے اس کی تمام تر ذمہ داری برطانوی عہدہ داروں پر ہے جو اہلِ مصر سے ہر موقع پر تحقیر آمیز سلوک کرتے رہتے ہیں اور مصر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو اس قسم کا تحقیر آمیز سلوک سخت ناگوار ہے۔
چنانچہ بعض نے تو اپنے اس غصّے کا اظہار سنجیدگی اور متانت سے کیا۔ لیکن بعض جوشیلے لوگوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا ہے۔ اور اس سے جو المناک واقعات رونما ہوئے ان کا خود حکومت مصر کو بھی افسوس ہے"۔

اگرچہ یہ خط لکھنے والا اس وقت گوشۂ لحد میں پڑا سوتا ہے لیکن تاریخ ہر زمانے

ہیں اس کی تحریر کی اہمیت اور اس کے مدلل اور معقول ہونے کی شاہد رہے گی۔
پاشا مرحوم کے آخری الفاظ ہر قسم کی تعریف سے مستثنیٰ ہیں۔ آپ لکھتے ہیں :-
"کسی قوم کی مدد کرنا ہر ملک کے مدبروں کا مقدس فرض ہے"۔

فیلڈ مارشل لارڈ ایلن بائی ایک مخلص آدمی تھا اور اس کی جس قدر تعریف کی جائے واقعی وہ اس کا مستحق ہے کیونکہ اس شخص کو اہلِ مصر کے جذبات سے مخلصانہ ہمدردی تھی۔ اس نے ایک موقع پر تو اہلِ مصر کی حمایت کرتے ہوئے اپنے عہدے سے استعفا دینے کی دھمکی دے کر لارڈ کرزن اور مسٹر لائڈ جارج کو اہلِ مصر کے مطالبات پر پھر منصفانہ غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا گو اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ فیلڈ مارشل ایلن بائی بھی ابتدا میں مصریوں کے جذبات سمجھنے سے قاصر رہا لیکن اس کے لئے ہم لارڈ ایلن بائی کو ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے اس بے اعتنائی کے ذمہ دار اس کے مشیر تھے جو اصل حالات سے اُسے آگاہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں زاغلول پاشا کو جو دوسری بار ملک سے جلا وطن کیا گیا تو اس کی وجہ بھی اصل حالات سے ہائی کمشنر کی ناواقفیت تھی لیکن حقیقت میں زاغلول کی جلا وطنی کا اصلی ذمہ دار مصر کا وزیر اعظم ثروت پاشا تھا۔ برٹش ریذیڈنسی مصری کیبنٹ کی اطلاعات کے مطابق مصر کی پالیسی میں ردّ و بدل کرتی رہتی تھی۔ ثروت نے زاغلول پاشا ایسے عالی دماغ اور محبِ وطن کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے جو چال چلی وہ یہ تھی کہ اُس نے اپنی حکومت کے ذریعے لارڈ ایلن بائی کو جو اس وقت مصر کا ہائی کمشنر تھا یہ یقین دلایا کہ جب تک مصر میں زاغلول پاشا موجود ہے مصری حکومت انگریزوں کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں

ہو سکتی اگر زاغلول اور اس کے قومی وفد کے اراکین کو مصر سے جلاوطن کر دیا جائے تو اس صورت میں حکومت مصر برطانوی مفاد اور اہلِ انگلستان کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھانے کو تیار رہے ÷

چنانچہ لارڈ ایلن بائی ثروت پاشا کے چکمے میں آگیا اور اس نے برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کے مشورہ سے زاغلول پاشا کو جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ وہ اٹھارہ مہینے جبرالٹر میں نظربند رہا۔ لیکن واپسی پر اہل مصر نے جس جوش کے ساتھ اپنے اس قومی رہنما کا استقبال کیا تاریخ اس کی نظیر کچھ کم ہی پیش کر سکتی ہے ÷

لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ اس تمام عرصے میں نہ تو لارڈ ایلن بائی نے زاغلول پاشا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور نہ خود زاغلول پاشا کی خودداری کو پسند تھا۔ کہ وہ ہائی کمشنر سے ملنے کی درخواست کرے اگر یہ دونوں عالی دماغ مدبّر ایک دُوسرے سے بالمشافہ گفتگو کر لیتے تو شاید واقعات ایسی ناگوار صورت اختیار نہ کرتے اور دونوں میں کوئی خوشگوار سمجھوتا ہو ہی جاتا ÷

---

(۸)

لارڈ ملنر کے کمیشن کی ناکامی کے بعد ۷ رجون ۱۹۲۰ء کو جب زاغلول پاشا انگلستان آیا تو وزرا برطانیہ کو مجبوراً مصری معاملات کے متعلق اس سے گفت و شنید کرنی ہی پڑی۔ یہ بحث وسط اگست تک جاری رہی اور آخر یہ گتھی سلجھانے کے لئے ایک مسودہ تیار کیا گیا۔ لیکن زاغلول پاشا مصر کی رائے عامہ

معلوم کئے بغیر کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے اس کی جماعت کے چار ارا کین مصر واپس آئے اور اہل ملک سے ان تجاویز کے بارے میں استصواب کیا۔ اور آخر "ملنر زا غلول" کے نام سے ایک عہد نامہ مرتب کیا گیا جس کی بڑی بڑی دفعات یہ تھیں:۔

۱۔ حکومت برطانیہ مصر کی خود مختاری تسلیم کرتی ہے اور خدیو مصر اپنی پارلیمنٹ کے مشورے سے ملک پر حکمرانی کرے گا ۔

۲۔ حکومت مصر تاج برطانیہ کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ مصر کے متعلق دوسری حکومتوں سے وہ جیسا سمجھوتہ چاہے کرے ۔

۳۔ حکومت برطانیہ مصر کی آزادی کی محافظ اور ذمہ دار ہوگی ۔

۴۔ جنگ کی صورت میں حکومت مصر اپنے حدود کے اندر حکومت برطانیہ کی امداد کرے گی ۔

۵۔ حکومت مصر کو غیر سلطنتوں میں اپنے نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور جس ملک میں مصری نمائندہ نہ ہوگا۔ وہاں برطانوی سفیر مصری حقوق کی نگہداشت کرے گا ۔

۶۔ حکومت مصر کسی غیر سلطنت سے اس قسم کا معاہدہ نہ کر سکے گی جس سے برطانوی مفاد کو نقصان یا کم از کم خطرے کا احتمال ہو۔ حکومت برطانیہ کو حق ہوگا کہ اپنے شاہی حقوق کی حفاظت کے لئے مصر میں انگریزی فوج رکھے ۔

۷۔ حکومت مصر ملک کی مالی حالت کو استوار کرنے کے لئے برٹش گورنمنٹ

کے مشورے سے ایک مشیر مال مقرر کرے گی ٭

۸۔ غیر اقوام کے حقوق کی نگہداشت کے لئے حکومت مصر اپنے محکمۂ مال میں ایک برطانوی مشیر کا تقرر منظور کرے گی ٭

۹۔ مصر میں برطانوی نمائندے کو دیگر سلاطین کے نمائندوں سے خاص امتیاز حاصل ہوگا ٭

اس معاہدہ کو اہل مصر نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ زاغلول پاشا نے مصر واپس آکر عدلی پاشا کی وزارت کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اسے ملک کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ عدلی پاشا نے انگلستان جا کر وزارت برطانیہ سے گفت و شنید کی لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی۔ زاغلول پاشا جب مصر کا وزیر اعظم مقرر ہوا تو محمد علی پاشا اور توفیق پاشا جیسے محبان وطن جو خود بھی وزارت عظمیٰ پر فائز رہ چکے تھے۔ اس کی کیبنٹ میں شامل ہو گئے۔ زاغلول پاشا نے ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق کا خاص خیال رکھا اور زاغلول کے وفد میں بھی یہ لوگ شامل رہے اور جب زاغلول اور اس کے رفیقوں کو ملک سے جلاوطن کیا گیا تو اس گروہ میں یہ لوگ بھی تھے۔ زاغلول پاشا نے برسراقتدار آتے ہی اکثر غیر مسلموں کو بھی اپنی کیبنٹ میں شامل کر لیا۔ بہت سے غیر مسلم انڈر سکرٹریوں کے علاوہ وزیر خارجہ مصر اور وزیر محکمہ رفاہ عام ایسے ذمہ دار عہدوں پر بھی غیر مسلموں کا تقرر کیا گیا۔ اسلامی خیرسگالی اور فراخدلی کی اس سے زیادہ شاندار مثال ملنی مشکل ہے ٭

---

(۹)

اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ مشکلات پیدا کیسے ہوئیں۔ اس کے لئے سب سے پہلے سوڈان کے مسئلہ پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ سوڈان کے متعلق حکومت برطانیہ کا کیا نظریہ ہے۔ حکومت برطانیہ کے بیان کے مطابق ۱۹ر جنوری ۱۸۹۹ء کو انگلستان اور مصر کے درمیان ایک عہد نامہ مرتب ہؤا جس کی رُو سے یہ قرار پایا کہ مصر اور برطانیہ مل کر سوڈان کا انتظام کریں گے۔ اس شرط کی وجہ یہ تھی کہ جب سوڈان نے خدیو مصر کی حکومت سے بغاوت کی تو برطانوی افواج نے مصری سپاہ کے ساتھ مل کر اسے فتح کیا۔ اسی ضمن میں دوسری شرائط یہ تھیں :۔

۱۔ سوڈان پر مصری قومی جھنڈے کے دوش بدوش برطانیہ کا پرچم بھی لہرایا جائیگا۔

۲۔ سوڈان کی حکومت ایک گورنر جنرل کے سپرد ہوگی جسے برطانیہ کی سفارش پر خدیو مصر نامزد کرے گا۔ محکمۂ مال اور محکمۂ فوج گورنر جنرل کے ماتحت ہونگے گورنر جنرل سوڈان دربار برطانیہ کے مشورے کے بغیر اپنے عہدے سے علیحدہ نہ کیا جائے گا ؞

۳۔ گورنر جنرل سوڈان کو اختیار ہوگا کہ قانون ملکیت میں اپنی مرضی سے تغیر و تبدل کرے اور برطانوی ہائی کمشنر مقیم قاہرہ اور وزیر اعظم مصر کو اطلاع کر دیا کرے۔

۴۔ سوڈان میں گورنر جنرل کی اجازت کے بغیر کوئی مصری قانون نافذ نہ ہو سکے گا ؞

۵۔ سوڈان میں مختلف اقوام کی مختلف عدالتیں قائم نہ ہو سکیں گی ؎

۶۔ حکومت برطانیہ کی اجازت حاصل کئے بغیر سوڈان میں کسی قوم کا نمائندہ مقرر نہ ہو سکے گا ؎

انگریزوں کے بیان کے مطابق یہ تھیں شرائط جو سوڈان کے متعلق خدیو مصر نے منظور کیں اور حقیقت میں عوام الناس بھی ایک مدت سے سوڈان پر انگریزوں ہی کا قبضہ متصور کرتے چلے آ رہے تھے ؎

۱۹ جنوری ۱۸۹۹ء کے عہدنامہ کی رو سے سوڈان پر برطانیہ کا قبضہ تسلیم ہوتا تھا۔ گو اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا۔ سوڈان کا گورنر جنرل جسے "سردار سوڈان" کہا جاتا تھا اس علاقے میں مطلق العنان حکمران سمجھا جاتا تھا اور وہی ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا ؎

لارڈ کچنر نے سوڈان میں ملکی اور فوجی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اہل برطانیہ نے اس ملک میں کپاس کی تجارت کو بہت فروغ دیا۔ لنکا شائر والوں کی نگاہیں بھی سوڈان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ انتظام ملک کے لئے کم و بیش ایک سو دس انگریز عہدہ دار مقرر تھے اور سوڈان مغربی تہذیب کے دوش بدوش ترقی کر رہا تھا اور اپنے بے اندازہ اقتصادی مفاد کے لئے برطانوی مدبروں کی تمام تر توجہ اس ملک کی طرف مبذول ہو رہی تھی ؎

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت برطانیہ ۱۹ جنوری ۱۸۹۹ء کے عہدنامہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور اس بات پر ہر پہلو سے

مصر بھی کہ اہلِ مصر عہدنامہ کی پوری پوری تعمیل کریں اور شرائط کے پابند رہیں ؎

دوسری طرف اہلِ مصر تھے اور اُن کی حکومت تھی۔ مصری یہ تسلیم کرتے تھے کہ واقعی سوڈان نے انگریزی نظام کے ماتحت کافی ترقی کی ہے لیکن ۱۹ر جنوری ۱۸۹۹ء کے عہدنامہ کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ ان کے نقطہ نظر سے یہ عہدنامہ ایک قسم کی یک طرفہ کارروائی تھی جسے صرف خدیو مصر نے مجبوراً منظور کیا تھا عوام الناس اس کے پابند نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان سے صلاح مشورہ نہیں کیا گیا تھا ؎

اہلِ مصر کے نقطہ نظر سے سوڈان پر انگریزی قبضہ ایک قابلِ اعتراض اور بالکل جابرانہ اور غیر منصفانہ فعل تھا۔ اس لئے وہ اس عہدنامہ پر پابند ہونے کیلئے تیار نہ تھے۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۴ء تک خدیو مصر برطانیہ کے پنجۂ استبداد میں ایک پر بریدہ پرندہ کی طرح تھا اس لئے اس کا کسی عہدنامہ کو قبول کرنا ملک کے لئے ہرگز قابلِ پذیرائی نہیں۔ سوڈان بھی اِسی ضمن میں آتا تھا ؎

۱۸۸۲ء میں جب برطانوی افواج سوڈان پر قابض ہوئیں تو مصری عساکر کو سوڈان خالی کرنے پر مجبور کیا گیا اور بصورت انکار فوجی کارروائی کی دھمکی دی گئی۔ اس وقت شریف پاشا مصر کا وزیر اعظم تھا اس نے یہ ذلت گوارا کرنے کی بجائے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا اور جو خط اس کے ساتھ لکھا اس کے آخری الفاظ سے اس کی غیرت جھلکتی نظر آتی ہے :-

"حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ مصر کے متعلق اس کا ہر ایک مطالبہ بلاچون وچرا قبول کر لیا جائے۔ یہ ناممکن ہے ؎"

شریف پاشا جیسے غیور آدمی کا جانشین نوبار پاشا ہُوا۔ یہ شخص ارمنی نسل سے تھا اس نے انگریزوں کے مطالبہ کے آگے سر جھکا دیا اور سوڈان سے مصری افواج واپس منگوالیں۔ حالانکہ کوئی مسلمان اس قسم کی ذلت گوارا کرنے کے لئے شاید ہی تیار ہوتا۔

مصریوں کے نقطۂ نظر سے ملک کے قانون کی رُو سے خدیو مصر کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ مصر کے کسی حصّے سے دست بردار ہو جائے۔ چہ جائیکہ سوڈان جیسا ملک غیروں کے حوالے کر دے۔

بین الاقوامی فیصلہ کی رُو سے بھی سوڈان کو مصر کا صوبہ تسلیم کیا گیا تھا اور ۱۸۹۸ء میں لارڈ سالسبری نے یہ اعلان کیا تھا۔

"وادی نیل اہلِ مصر کی ہے اور ہمیشہ اہلِ مصر ہی کے قبضے میں رہے گی۔"

حکومت برطانیہ بھی ایک موقع پر سوڈان کو مصر کا صوبہ تسلیم کر چکی تھی اور سوڈان پر مصر کا قبضہ جائز سمجھتی تھی۔

اہل مصر کو سوڈان کے نظم و نسق کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۲ء تک حکومتِ مصر سوڈان پر اٹھارہ ملین پونڈ صرف کر چکی ہے۔ اور آب پاشی وغیرہ کے کاموں پر جو روپیہ صرف ہُوا وہ اس کے علاوہ ہے اسی طرح تیس فی صدی کے قریب کپاس کی فصل بھی دوسروں کی نذر کرنی پڑی اور اگر تمام اخراجات کو دیکھا جائے تو مصر سوڈان پر ستر ملین پونڈ صرف کر چکا ہے مصریوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ سوڈان برطانوی امداد سے دوبارہ فتح کیا گیا لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اہل مصر نے بھی اس کے لئے خون اور روپیہ پانی کی طرح

بہایا - پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مصری فوج کو زبردستی سوڈان سے نکال دیا جائے؟

آج بھی سوڈان کی حفاظت کے لئے جو چودہ ہزار سپاہ وہاں موجود ہے اس میں مصری - سوڈانی - حبشی اور عرب سبھی لوگ شامل ہیں *

۱۹۱۳ء سے حکومت مصر نے سوڈان کو مالی امداد دینا بند کر دیا - کیونکہ سوڈان کی آمدنی میں سے حکومت مصر کو پھوٹی کوڑی نہیں ملتی تھی - سوڈان پر مصر کا قبضہ ہونا سیاسی نقطہ نگاہ سے بہت اہم تھا - اور اہلِ مصر اس کی اہمیت خوب سمجھتے تھے - اس لئے اب خالی وعدوں سے انہیں رام نہیں کیا جا سکتا تھا - اس لئے برطانیہ کو لازم ہے کہ انہیں اپنی مخلصانہ دوستی کا یقین دلا کر سوڈان کے متعلق حکومت مصر سے کچھ ایسا سمجھوتہ کرے جو اہلِ مصر کو مطمئن کر سکے - ۱۹ جنوری ۱۸۹۹ء کو دونوں مملکتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا - اہلِ مصر اسے قبول کرنے کو تیار نہیں - بلکہ انہیں امید ہے کہ دربار انگلستان سوڈان کے متعلق ان سے کوئی ایسا معاہدہ کرے جو حق اور انصاف پر مبنی ہو *

سوڈان کے متعلق زاغلول پاشا وزیر اعظم مصر نے ایک موقع پر کہا تھا :-

" اگر برطانیہ کی خواہش ہو تو ہم سوڈان کے متعلق دوستانہ گفتگو کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں - ہم سوڈان میں انگریزوں اور دیگر اقوام کے سب جائز حقوق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے -

کہ اہلِ مصر کے جائز حقوق پر غیر اقوام کے حقوق کو فوقیت دی جائے
مناسب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں اپنے اپنے دعویٰ پر مخلصانہ غور کریں
جس میں فوجی تشدد کا شائبہ تک نہ ہو اور نہ ہی کسی اور قسم کا دباؤ ڈالا
جائے *

میں اہلِ انگلستان سے صرف اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے
مقابلے میں کس طرح سوڈان پر اپنا حق فائق سمجھتے ہیں۔ سوڈان کے
متعلق جلد یا بدیر ہمیں کچھ نہ کچھ فیصلہ تو ضرور ہی کرنا پڑے گا۔ اور اگر
حکومت برطانیہ سوڈان کے مسئلہ کے متعلق مصری حکومت پر ناجائز
دباؤ ڈالے گی تو میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں گا کیونکہ جبر و
تشدد کے مقابلے میں اگر اخلاقی جرات سے کام لیا جائے تو وہ زیادہ
مؤثر ثابت ہوتا ہے *

ہم اس بات کے لئے بھی تیار ہیں کہ مصر اور برطانیہ اپنا معاملہ "انجمن
اقوام عالم" کے سامنے پیش کر دیں اور سوڈان کے متعلق جو فیصلہ ہو
دونوں بلا چون و چرا تسلیم کریں *

۱۹-۱۹۱۸ء اور ۲۳-۱۹۲۱ء تک زاغلول پاشا ہمیشہ صلح اور آشتی
کی پالیسی کا اظہار کرتا رہا۔ اور ہر موقع پر انگریزوں کی طرف تعاون اور
دوستی کا ہاتھ بڑھایا تاکہ مصر اور انگلستان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہیں۔
اور ناخوشگوار واقعات کا دونوں کو کبھی سامنا نہ کرنا پڑے *

(۱۰)

لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے کہ مصر اور حکومت انگلستان کے آئندہ تعلقات کا دارومدار صرف "نہر سویز" کے مسئلہ کے خوشگوار حل پر ہے مصر کی قومی انجمن یہ چاہتی ہے کہ نہر سویز پر کسی کا قبضہ نہ ہو اور لیگ آف نیشنز کے ماتحت اسے استعمال کیا جائے ؛

ایک مدت سے یورپ کے سیاست دان اس مسئلہ کے حل کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۸۷۹ء میں بین الاقوامی قانون کے ماتحت یہ قرار پایا تھا۔ کہ وہ حکومتیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں۔ نہر سویز کی غیر جانب داری کا احترام کریں۔ اور حکومت مصر کی اجازت کے بغیر یہاں نہ تو کوئی اپنی فوج اتار سکے نہ ذخائر جنگ جمع کر سکے۔ لیکن انگلستان نے یہ تجویز منظور نہ کی اور یہ مطالبہ کیا کہ برطانوی بیڑے کو نہر سویز سے گزرنے کا ہر وقت اور ہر صورت میں حق دیا جائے ؛

قسطنطنیہ میں دول عظام کی کانفرنس میں یہ فیصلہ ہؤا تھا۔ کہ نہر سویز کی حدود سے تین تین بحری میل تک کسی قسم کی جنگی کارروائی نہ کی جائے گی۔ فرانس نے یہ ترمیم پیش کی کہ نہر سویز کے اندر یا بندرگاہ کے قرب و جوار میں یا وہ سمندر جس پر مصر کا اقتدار ہے۔ ان مقامات کو جنگی کارروائی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ لیکن انگلستان نے اس ترمیم کی بھی مخالفت کی اور اپنی پہلی تجویز پر زور دیا۔

حالانکہ اس وقت ایسی توپیں تیار ہو چکی تھیں جو تین میل سے زیادہ فاصلہ تک گولہ پھینکتی تھیں ؛

رُوس نے یہ تجویز پیش کی کہ بحر احمر کو غیر جانبدار قرار دیا جائے لیکن چونکہ اس میں خلیج عدن بھی شامل ہوتی تھی اس لئے انگلستان نے ہندوستان کی حفاظت کے خیال سے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ نہر سویز پر سلطنت برطانیہ کے چونکہ مقبوضات کی حفاظت کا انحصار ہے۔ اس لئے برطانوی بیڑے کو نہر سویز سے گزرنے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیئے ؛

۱۸۸۸ء کی قرارداد کے مطابق کسی سلطنت کو یہ اختیار نہ تھا کہ نہر سویز میں اپنے جنگی جہاز رکھے۔ صرف پورٹ سعید میں سب حکومتوں کو دو دو جنگی جہاز رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور اس کی نگرانی کے لئے دول عظام کے ان نمائندوں کی جو مصر میں مقیم تھے ایک کونسل بنائی گئی تھی۔ اس کونسل کا صدر ترکی کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ اور حکومت مصر کے نمائندے کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ ترکی کے ہائی کمشنر کی عدم موجودگی میں صدارت کے فرائض انجام دیا کرے۔ ان لوگوں کا فرض تھا کہ سال میں ایک بار دورہ کر کے حالات کا معائنہ کریں اور اگر انہیں نہر کسی خطرے میں نظر آئے یا کوئی سلطنت قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہو تو اس کی رپورٹ حکومت مصر کے پاس جو نہر سویز کی نگرانی کی ذمہ دار تھی کریں اور حکومت مصر کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ خود مناسب کارروائی کرنے کے قابل نہ ہو۔ تو پھر حکومت ترکی سے امداد لے یا اپنی فوج سے اپنے حکم کی تعمیل کرائے ؛

لیکن برطانیہ نے اس "اپنی فوج" کی شرط پر بھی اعتراض کیا مگر انجام کار اسے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ لیکن کچھ روز بعد جب انگلستان نے مصر پر قبضہ کر لیا تو یہ سب قوانین اور شرائط چھپّر پر رکھی رہ گئیں اور انگریز مصر میں من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ لیکن چشم بینا سمجھتی تھی کہ کبھی بقول حضرت اقبال یوں بھی ہوتا ہے کہ ؎

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی مُوسیٰ طلسمِ سامری
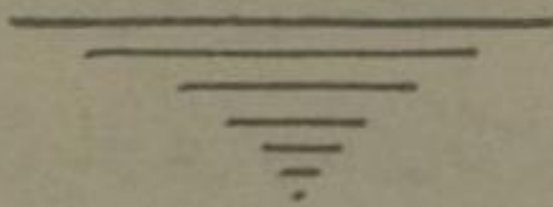
رُوس

اور

ایشیائے کوچک

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(اقبال)

دُنیا کے اس عظیم الشان ڈرامہ کا (یعنی ایشیائے کوچک کا مسئلہ) انجام ابتدا سے ہی افسوسناک نظر آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق دانایان فرنگ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسے جس رنگ میں چاہیں رنگ سکتے ہیں۔ اس ڈرامہ میں سب سے نمایاں حصّہ زار کی حکومت نے لیا ہے اور آج ہمیں زار کی خارجی سیاست کا مطالعہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ آرمینیا کے متعلق رُوس کا نظریہ کیا رہا ہے ۞

آرمینیا جس کا آج سے کچھ عرصہ پہلے مشرقی معاملات میں بہت کم ذکر ہوتا رہا۔ جنگ یورپ کے دوران میں جب اس کا رُوس سے اتحاد ہو گیا تو ایشیائے کوچک کا یہ چھوٹا سا علاقہ رُوسی حکومت کے ہاتھ میں کٹ پُتلی بن گیا اور وہ خونی کھیل جو ابھی ابھی دنیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی اصلی وجہ یہی آرمینیا تھا جس کے خانگی معاملات نے دول یورپ کو ایک دُوسرے کا حریف بنا دیا ۞

دارالعوام برطانیہ کے اکثر اراکین ۱۹۱۳ء ہی سے یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے اور رُوس اور آرمینیا کے گہرے تعلقات کے متعلق وزیر خارجہ سے اکثر استفسار کرتے رہتے تھے لیکن وزارت انگلستان کی چونکہ روس کے متعلق خیرسگالی کی پالیسی

تھی اس لئے وزیر خارجہ انگلستان سرایڈورڈ گرے اس معاملہ کو عموماً پسِ پشت ڈال دیتا۔ حالانکہ اکثر اراکین دربارِ انگلستان کو یہ یقین تھا کہ رُوس کی یہ شاطرانہ چالیں ایشیائے کوچک میں ایک دن کوئی گُل کھلا کر رہیں گی ؎

اگر ان واقعات کا جنہیں دیدہ و دانستہ دُنیا کے سامنے ایک خوفناک شکل و صُورت میں ہمیشہ پیش کیا جاتا رہا غور سے مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ آرمینیا کے معمولی واقعات کو خوفناک بنا کر پیش کرنے میں اخبارات نے بھی بہت حصّہ لیا اور محض بے سروپا باتوں کو ایسا رنگ دے کر مشتہر کیا کہ ہر پڑھنے والے کے جذبات مشتعل ہو جاتے۔ حالانکہ وہی بھیڑ اور بھیڑیئے کی داستان سے زیادہ ان فرضی واقعات کی اور کوئی اہمیت نہ تھی۔ یعنی خوئے بدرا بہانۂ بسیار! کیا سیاست دان اور کیا اخبارات سب یکزبان ہو کر مسلمانوں کو کوس رہے تھے اس تمام ناپاک پراپیگنڈے کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان روزِ اوّل سے کُشت و خون کا دلدادہ ہے اور مسیح علیہ السلام کی غریب بھیڑوں سے خون کی ہولی کھیلنے کا عادی ہے اور یورپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان گردن زدنی ہے اور اس کا وجود بنی نوع انسان کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ رہے مشرق میں بسنے والے عیسائی تو یہ لوگ ہمیشہ مظلوم۔ بے گناہ اور صلح کُن متصوّر ہوتے رہے ہیں۔ یورپ کے سلاطین میں سے زارِ روس مشرق کے عیسائیوں کی اس طرح حمایت کرتا تھا۔ جیسے ماں اپنے بچے کی ہمیشہ بے جا حمایت اور طرفداری کیا کرتی ہے ؎

سلاطین یورپ آرمینیوں کی حمایت اور طرف داری محض اس لئے کرتے

تھے کہ یہ صوبہ ترکوں کے زیر نگین تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ آرمینیا میں آئے دن فساد ہوتے رہتے تھے لیکن یہ فساد کیوں ہوتے تھے یا ان فسادات کی تہ میں کسی بیرونی حکومت کا ہاتھ بھی ہے یا نہیں یہ معلوم کرنے کی کبھی کسی نے ضرورت نہیں سمجھی۔ رہا ترکوں کو ان فسادات کا مجرم ٹھہرانا تو یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ ترکوں پہ الزام لگانے والے وہی لوگ تھے جو اپنی سیاسی مصلحتوں کے ماتحت آرمینیا میں فساد کراتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مجرم کبھی یہ نہیں چاہتا کہ جرم کی تحقیقات کی جائے۔

مشرق میں اسلام اور مسلمان کے خلاف جو زہر ہمیشہ پھیلایا جاتا رہا۔ اُس نے ترکوں اور عیسائیوں کو کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ لوگ جو بزعم خود سلطنت عثمانیہ کے نبض شناس بنے بیٹھے تھے یہ تو سمجھتے تھے کہ مریض دن بدن کمزور ہو رہا ہے لیکن مریض کی کمزوری دور کرنے کو جو علاج تجویز کیا جاتا وہ صحت کی نسبت اسے قبر کی طرف لے جانے والا ہوتا۔ اس کا صحیح علاج تو یہ تھا کہ زار کی حکومت ترکوں کے خلاف جو زہر پھیلا رہی تھی۔ اس کی روک تھام کی جائے اور فریب خوردہ لوگوں کو اس کے اثر سے بچایا جائے۔

مشرق میں ترکوں کے خلاف روس کی ریشہ دوانیاں اس قدر موثر اور کامیاب ہو چکی تھیں کہ اکثر سلاطین یورپ بھی اس تر لقمہ میں حصہ لینے کی اُمید لگائے بیٹھے تھے اور ترکی کے حصے بخرے کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

اُنیسویں صدی میں انگلستان میں "ڈیوڈ اُرکوہارٹ" ہی ایک ایسا صاحب نظر پیدا ہؤا تھا جس نے حکومت برطانیہ کو آنے والے خطرات سے متنبہ کر لے

کی کوشش کی۔ یہ اسی کی دُور اندیشی کا نتیجہ تھا کہ لارڈ پامرسٹن اور لارڈ بیکن فیلڈ کھلے بندوں مشرق میں رُوس کی حکمتِ عملی کی مخالفت کرنے لگے۔ لیکن افسوس ان دونوں سیاست دانوں کو یہ خیال کبھی نہ آیا کہ وہ مشرقی اقوام کو مدد دے کر اس فتنہ کا استیصال کریں ؂

یورپ کی تاریخ میں پھر ایک ایسا وقت بھی آیا۔ کہ حکومت برطانیہ نے زار نکولس دوم شہنشاہ رُوس کی دوستی کی خاطر جو محض ایک سیاسی ضرورت تھی مشرق میں اصلاحات کا مفید کام چھوڑ کر زار کی تباہ کُن پالیسی کے لئے میدان خالی کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء کے اتحادِ ثلاثہ کے بعد روس پھر ایک بار چاق چوبند ہو کر مشرق میں اپنی تباہ کُن پالیسی کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ کیونکہ دربارِ انگلستان نے رُوس کی پاس خاطر سے مشرق کے معاملات میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور یورپ میں ترکوں کی بے دست و پائی نے آرمینیا کا مسئلہ اقوام مغرب کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ چنانچہ رُوسی مفاد کی خاطر اہلِ آرمینیا قربانی کا بکرا بنائے گئے ؂

بجائے اس کے کہ ہم ان اختلافات پر بحث کریں جنہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دُوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا تھا کیونکہ ان اختلافات کے باوجود مسلمان اور عیسائی بسا اوقات صلح اور آشتی سے بھی رہتے رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان واقعات سے جو خون آشام نتیجہ نکلا اس کے اصلی ذمہ دار کون تھے ؂

کیا واقعی یورپ ہی اس خُونی سرکس کا رنگ ماسٹر تھا۔ یا بس وُہی بھیڑ اور

بھیڑئیے والی کہانی تھی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے سیاست دان ارمینیا میں جو کُشت و خون وقتاً فوقتاً ہوئے ہمیشہ اس کا اخلاقی پہلو زیر بحث لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کو کبھی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھنا چاہیئے کہ جنگ یورپ کے وقت ان کا اپنا اخلاق کہاں سو رہا تھا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ چور کا بھائی چور اور چور یا ڈاکو کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ ناصح بن کر دوسروں کو اخلاقیات کی تعلیم دیا کرے ؞

حقیقت یہ ہے کہ آرمینیا میں جو کچھ ہُوا ہمیشہ زار روس کے ایما سے ہُوا جو پالیسی پیٹر اعظم نے یوکرین کے متعلق اختیار کی تھی وُہی نکولس دوم کی آرمینیا کے متعلق تھی۔ روس کی ملکہ کیتھرین دوم نے بھی اہل پولینڈ کی بیخ کنی کے لئے یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ الیگزینڈر اوّل شہنشاہ روس نے اسی پالیسی کو یونان میں روا رکھا اور زار نکولس اوّل اور اس کے جانشین بلقان اور ایشیا کے متعلق اسی تباہ کُن پالیسی پر ہمیشہ کاربند رہے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترکوں نے آرمینیا والوں سے اگر سخت برتاؤ کیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت روس پر عائد ہوتی ہے۔ نہ روس آرمینیا میں شورشیں برپا کرواتا نہ ترکوں کو انہیں فرو کرنے کے لئے تشدد سے کام لینا پڑتا

آرمینیا کے مسئلہ کو سمجھنے سے پیشتر یہ دیکھنا چاہیئے کہ سلاطین یورپ ترکی کے متعلق کس پالیسی یا پروگرام پر عمل کر رہے تھے ؞

مارشل مولٹکے جو ۳۶-۱۸۳۵ء میں جرمن افواج میں کپتان تھا اور جرمنی کی طرف

سے عساکرہ عثمانیہ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اور مشرقی معاملات پر بہت عبور رکھتا تھا
ایک خط میں لکھتا ہے کہ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ترکی کے معاملہ میں جس
قدر دلچسپی سلاطین یورپ لیتے رہتے ہیں۔ خود ترکوں میں بھی ایسی گرمجوشی نظر نہیں آتی
سلطان محمد ثانی نے اپنے عہد میں سلطنت ترکی اور ترکوں کی معاشرتی اور اقتصادی
اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی اور پرانے خیال کے ترکوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے
کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ مارشل مولٹکے کی نگاہ میں سلطان محمد ثانی کی یہ اصلاحات
تاریخی پہلو سے وہی وقعت رکھتی ہیں جو پیٹر اعظم نے روس میں جاری کی تھیں لیکن
مارشل مولٹکے ترکی میں ان اصلاحات کے ناکام رہنے کا ذمہ دار تمام تر یورپ کو
قرار دیتا ہے جس نے ہر ممکن طریق سے اس مفید کام میں مشکلات پیدا کیں۔ پیٹر اعظم تو
دنیا سے الگ بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا اور کوئی معترض نہ تھا لیکن ترکوں کو قدم قدم پر
رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

قدامت پسند ترکوں کی مخالفت کے علاوہ یورپ کی ریشہ دوانیوں کا انسداد
بھی ضروری تھا۔ یورپ کی ان شاطرانہ چالوں کا جو نتیجہ ہمیشہ نکلا اس پر بحث کرنے کی
چنداں ضرورت نہیں۔ مارشل مولٹکے صرف ان باتوں کو زیر بحث لاتا ہے جن سے ایک
صدی تک مسلمانوں کو ہر قسم کی ترقی سے محروم رکھا گیا۔ سلاطین یورپ (جو آج تک
ساکنان مشرق کی ذہنیت ہی نہیں سمجھ سکے) طرح طرح کے مطالبات اور اعتراض
کر کے ترکی میں ہر اصلاحی کام میں رکاوٹ پیدا کر دیتے تھے۔ ترک مادر وطن اور
سلطنت عثمانیہ کی ہستی برقرار رکھنے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا بہا کر کمزور
ہو چکے تھے۔ اگر انہیں بھی آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو پیٹر اعظم کے برعکس

جس کے مظالم اور جبر و تشدد کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ وہ زیادہ آسانی سے اپنی مشکلات پر قابو پا لیتے۔ انگلستان میں یا انگلستان سے باہر تمام مستشرقین یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ قرآن نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو کبھی ممنوع قرار نہیں دیا۔ بشرطیکہ یہ تنظیم عین اسلام کی تعلیم کے مطابق ہو۔ اور یہ تنظیم کا کام ایک ایسی اسلامی سلطنت کے ہاتھ میں ہو جس پر کسی بیرونی سلطنت کا دباؤ نہ ہو ؞

دوران جنگ میں جس قدر انگریزوں کو اناطولیہ کے باشندوں سے واسطہ پڑا ہے وہ ان کے اخلاق کے بہت معترف پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں اصلاحات جاری کرنے کے لئے کسی حکومت کو جبر و تشدد سے کام لینے کی ضرورت نہیں حالانکہ دوسری اقوام میں جہاں بھی اصلاحات جاری کی گئیں۔ تشدد کئے بغیر کبھی کام نہیں چل سکا۔ اناطولیہ کا باشندہ فطرتاً بہت سادہ لوح واقع ہؤا ہے اور اپنے ملک کی اقتصادی ترقی کا ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ آرمینیا کا مسئلہ جب کبھی یورپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے فرضی مظالم کی داستان پھیلانے سے کبھی گریز نہیں کیا گیا اور یہی وجہ ہے کہ ایشیائے کوچک میں بسنے والے عیسائی اہلِ مغرب کی امداد کے ہمیشہ منتظر بھی اور دست نگر بھی رہے ہیں لیکن یہ سب من گھڑت قصے ہیں۔ کیونکہ تاریخ صاف بتلا رہی ہے کہ آج سے برسوں پہلے ترک اور ارمینی صلح و آشتی سے رہتے تھے وہ لوگ جنہیں عثمانیوں کی تاریخ پر عبور ہے جانتے ہیں کہ ترکی میں جس قدر فرقہ دارانہ فسادات ہوئے یہ سب غیر اقوام کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھے ؞

سلطان محمد فاتح نے جو سلوک ان اقوام سے کیا تھا جو بازنطینی حکومت کے زوال کے بعد ترکوں کے زیر نگیں آئیں اس دعویٰ کی دلیل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سلطان

نے جو فیاضانہ برتاؤ ان قوموں سے کیا ایک فاتح اپنے مفتوح سے شاذ و نادر ہی کیا کرتا ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس زمانے کے مؤرخ ان باتوں کو بالکل نظرانداز کئے چلے جا رہے ہیں تعجب ہے کہ دُنیا یہ تو بالکل ہی بھُول گئی کہ وہ سلطان محمد فاتح ہی تھا جس نے ایک دُنیا کو متعصب پادریوں سے نجات دلائی تھی اور اپنی ترکی سلطنت کے ماتحت ہر طرح کی مذہبی آزادی عطا کی تھی۔ وہ آزادی جو عیسائیوں کو یورپ میں بھی کبھی نصیب نہ ہو سکی ؞

پروفیسر سر تھامس ڈبلیو آرنلڈ اپنی مشہور کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں جو پہلے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ اسلامی افواج نے کبھی عیسائیوں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسلامی افواج سے صرف اسلامی مقبوضات کی حفاظت اور مُلک کے نظم و نسق کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بازنطینی حکومت کے عیسائی باشندے اپنے ہاں کے پادریوں کے جبر و تشدد سے بھاگ کر ترکوں کے ہاں آ کر پناہ لیتے تھے ؞

مشہور اطالوی مستشرق "ڈان لی آن کیٹانی۔ پرنس آف ٹی آنو اور ڈیوک آف گرمونیٹا" (DON LEONE CAETANI PRINCE OF TEANO AND THE DUKE OF GERMONETTA) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (ANNALS OF ISLAM) میں اس بیان کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں کی رواداری کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس قسم کی مذہبی رواداری کی کسی اور قوم کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی ؞

اسی طرح آرمینیا کے عیسائی بھی اپنی مذہبی آزادی - اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے ہمیشہ ترکوں کے ہی منت پذیر رہے - آرمینیوں کو حکومت خودمختاری کا بہت کم موقع ملا - اور وہ ہمیشہ غیر اقوام ہی کے ماتحت رہے اور چونکہ یہ لوگ فطرتاً کسی کا احسان نہیں بھولتے اس لئے جس قوم کے بھی ماتحت رہے اس نے ان سے بہت اچھا سلوک کیا - اسی طرح جب تک وہ ترکوں کے زیر نگیں رہے اور ان کے وفادار رہے ترکوں نے بھی ان سے ویسا ہی حسن سلوک کیا اور سلطان شاہی مراعات سے نوازتا رہا ؛

سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تو بروحہ کے اسقف اواقیم کو قسطنطنیہ میں بلا کر تمام ارمینی اقوام کا اسقف اعظم مقرر کر دیا - اور شاہی نوازشات اور مذہبی آزادی عطا کر کے سب آرمینیوں کو حلقہ بگوش بنا لیا - اس احسان کے بدلے ارمنی سرداروں نے بھی سلطان کی ہر موقع پر قابل قدر خدمات کیں اور اس کے عوض میں انہیں سلطنت عثمانیہ میں اچھے اچھے عہدے تفویض کئے گئے - وہ عیسائی قومیں جو ترکوں کی محکوم تھیں ان میں سے صرف آرمینیا کے عیسائیوں پر ترکوں کو ہمیشہ اعتماد رہا - اور انہیں کامل یقین تھا کہ آرمینی ترکوں کے خلاف روس کی چالوں میں نہ آ سکیں گے اور اپنے محسنوں سے کبھی دغا نہ کریں گے - انیسویں صدی تک بھی اہل ارمینیا ہر موقع پر ترکی حکومت کو روس پر ترجیح دیتے رہے اور ترک بھی ان لوگوں کے مذہب - زبان اور رسم و رواج میں کبھی مخل نہ ہوئے ؛

"کانگریس آف برلن" کے بعد ترکوں کی پالیسی میں جو تبدیلی ہوئی اور اس کے بعد وہ کشت و خون جو سلطان عبدالحمید خاں کے وقت میں ہوئے یا کردوں کی لوٹ مار سے کچھ تعلق نہیں ؛

ترکوں اور اہلِ آرمینیا کے صدیوں کے دوستانہ تعلقات کا مقابلہ تیس چالیس برس کی فرقہ وارانہ منافرت سے نہیں کیا جا سکتا اور ان فسادات کے متعلق جو بیانات اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے وہ ہرگز قابلِ پذیرائی نہیں کیونکہ اس وقت دولِ یورپ ترکوں کو تباہ اور برباد کرنے کے لئے ایک بہت ناپاک پراپیگنڈا ان کے خلاف کر رہے تھے۔ یونان کی جنگ آزادی کے وقت جب آرمینیا کے مختلف فرقوں میں اپنے مذہبی اختلاف کے باعث فساد ہوئے اور وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے تو ترکوں ہی نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں ایسی تباہی سے بچا لیا۔ جس طرح ایک زمانے میں ترکی پولیس نے بیت المقدس میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے سے روکا تھا۔ اسی طرح کئی بار ترکوں نے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کو مختلف مقامات پر ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگنے سے باز رکھا ❊

آرمینی مؤرخ متعدد بار یہ مان چکے ہیں کہ جو آزادی اہلِ آرمینیا کو ترکوں کے ماتحت رہ کر ملی۔ وہ روس کی سیادت میں کبھی نصیب نہ ہوئی لیکن ترک یورپ کی طعن و تشنیع سے کبھی بھی محفوظ نہ رہ سکے گو ۱۹۰۹ء میں سلطان عبد الحمید خاں کے عہد حکومت میں اوانا میں جو ارمنی قتل ہوئے اس کے ذمہ دار وہ ترک قرار دیئے جاتے ہیں جو مجلس اتحاد و ترقی (COMMITTEE OF UNION AND PROGRESS) کے رکن تھے۔ اس کشت و خون کی تحقیقات کا کام ترکی پارلیمنٹ کے ایک ارمنی ڈپٹی " اگوپ آفندی بابی کیان " کے سپرد کیا گیا تھا۔ بابی کیان نے اپنی رپورٹ میں اوانا کے فسادات کا ذمہ دار اوانا کے ترک

حکام اور "کمیٹی" کے چند اراکین کو ٹھہرایا ہے ؎

اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انقلاب ترکی کے بعد جو لوگ ترکی کی ترکیب نو کے حامی تھے انہوں نے ملک میں "مجلس اتحاد و ترقی" کے نام سے ایک جمعیت قائم کی تھی اس جمعیت میں کچھ ایسے غدار بھی شامل تھے جو ابتدا ہی سے اس جمعیت کو بدنام کرنا چاہتے تھے لیکن تحقیقات کے بعد جب ان اراکین کا جرم ثابت ہو گیا اور جو سزائیں انہیں دی گئیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم ساری جمعیت کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے ؎

ایک وہ وقت تھا کہ اہل آرمینیا روسی مظالم سے تنگ آکر ترکوں کے پاس پناہ لیتے تھے پھر ایک وقت وہ آیا کہ یہی اہل آرمینیا زار نکولس دوم اور سلطان ترکی کے نام سے بھی بیزار ہو گئے۔ کیونکہ ان دونوں تاجداروں نے انہیں طرح طرح سے تنگ کیا ؎

ایک دنیا جانتی ہے کہ ۹۶-۱۸۹۵ء کے درمیان سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں آرمینیوں کی سرکشی اور شورش کی وجہ سے ان پر جو ظلم و تشدد ہوا اور عیسائیوں نے سلطان کو "خونی سلطان" کا خطاب دیا۔ اس تشدد کا ذمہ دار محض زار روس اور اس کے مشیر تھے جنہوں نے آرمینیا والوں کو بغاوت اور شورش پر ابھارا۔ روسی وزیر خارجہ پرنس لوبناف روسٹوسکی کا سرکاری بیان ہمارے اس دعویٰ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

" روس اپنی سرحد پر ایک ایسا آرمینیا دیکھنا چاہتا ہے جس میں

ایک ارمینی بھی مخالف نظر نہ آسکے"۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ایشیائے کوچک میں جو ارمنی اقوام آباد تھیں وہ اپنے علاقوں کا روس سے الحاق پسند نہ کرتی تھیں لیکن بیس برس بعد واقعات نے پھر ایسی صورت اختیار کر لی کہ یہی آرمینیا والے پھر زار اور سلطان دونوں کے خلاف زہر اگلنے لگے اور جو روزِ بد کچھ روز بعد سلطان کو دیکھنا پڑا دس سال بعد وہی حشر زارِ روس کا بھی ہوا۔

ایک مشہور ارمنی مؤرخ نے ارمینیا کے متعلق چو بیس مضامین سلسلہ وار لکھے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ارمنی کی انقلابی انجمن نے یہ سب جنیوا میں شائع کرا دیئے۔ ان مضامین میں صاف صاف الفاظ میں یہ اقرار کیا گیا تھا کہ انیسویں صدی میں اہلِ آرمینیا نے زار کے وعدوں پر اعتبار کر کے ایسے مخلص یعنی ترکوں سے جو بگاڑ پیدا کر لیا یہ ان کی ایک خوفناک سیاسی غلطی تھی۔ ۱۸۲۶ء سے ۱۹۱۳ء تک جس قدر واقعات رُونما ہوئے ان سے اہل آرمینیا کو معلوم ہو گیا کہ زار اور اس کی حکومت محض اپنا مطلب نکالنے کے لئے انہیں سبز باغ دکھلاتی رہی اور طرح طرح کی فریب کاریوں سے اپنا اُلّو سیدھا کرتی رہی۔

حکومت روس کو جب کبھی ارمنی والنٹیروں کی ضرورت پڑی چکنی چپڑی باتوں سے انہیں اپنے جال میں پھنسا لیتی۔ اٹھارھویں صدی میں روس کی ملکہ کیتھرین دوم نے بھی آرمینیوں سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی بڑی بڑی شرائط یہ تھیں:-

۱۔ روس آرمینیا کی خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے۔

۲۔ آرمینیا کے حکمران کا تقرر حکومت روس کے ماتحت ہو گا۔

۳۔ آرمینیا روس کا باجگزار رہے گا۔

۴۔ آرمینیا میں روسی فوج کے رہنے کا انتظام کیا جائے گا۔

لیکن روس کی طرف سے آرمینیا والوں سے جو وعدے ہوئے ان کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ نہ تھی کہ ع

مزے میٹھے اثر خواب آور ہی!

۱۸۵۷ء میں اہل آرمینیا نے روس کی جو نمایاں فوجی خدمات کیں۔ اُن کا معاوضہ صرف شکریہ کا ایک شاہی فرمان تھا۔

جنگ کریمیا اور ۱۸۷۸ء کی جنگ روس اور ٹرکی کے وقت آرمینیا کا مسئلہ اقوامِ مغرب کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ اس وقت ترکوں پر دربارِ انگلستان کی نظرِ عنایت تھی۔ فرانس اور انگلستان دونوں روس کی مخالفت پر جمے ہوئے تھے۔ اور ترکوں کے معاون تھے۔ آج جو حربہ ترکوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے وُہی ہتھیار اُس وقت رُوس کے خلاف استعمال ہوتا تھا۔ جبکہ یہی اہلِ فرنگ قرآنِ حکیم کی سند پیش کر کے مسلمانوں کی رحم دلی۔ مذہبی رواداری اور قومی شرافت کے گُن گاتے نظر آتے تھے۔ اور رُوس کے کلیسا کی بُرائیاں گنواتے تھے لیکن آج وہی اہلِ انگلستان مشرق میں رُوس کی متشددانہ پالیسی کو جائز سمجھ کر ٹس سے مس نہیں ہوتے ہمیں وہ وقت بھی یاد ہے جب یہی آرمینیا والے کبھی تُرکوں کے گُن گاتے تھے لیکن اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اتفاقات

ہیں زمانے کے اِقسطنطنیہ میں ارمینیا کا جو اسقف رہتا تھا مذہبی پیشوا ہونے کے علاوہ وہ اپنے ملک کے قانون کے مطابق اہلِ آرمینیا کے باہمی مقدمات کا بھی فیصلہ کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک آرمینی کلیسا زارہ کے اثر سے محفوظ رہا ترکوں اور آرمینیا کے تعلقات بہت خوشگوار رہے ؂

لیکن ۱۸۶۰ء میں آرمینیا کے مختلف مذہبی گروہوں میں نفاق پیدا ہوگیا۔ آرمینیا کا اسقف اعظم ایک ڈکٹیٹر کی طرح اپنے پادریوں سے برتاؤ کرنے لگا۔ اس وقت بھی ترکوں نے ان کے خانگی معاملات میں دخل دینا پسند نہ کیا۔ اس وقت بقول ایک آرمینی پرنس "دادائین" جو سیاست دان بھی تھا اور اہلِ قلم بھی۔ آرمینیا کی قومی کونسل سازشیوں کا ایک جتھا تھا اور آرمینیا کا اسقف اعظم ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ آخر قومی کونسل کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر اہلِ آرمینیا نے سلطان المعظم کے حضور میں فریاد کی۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں سلطان کے حکم سے ایک سپریم کونسل (کونسل اعلیٰ) وجود میں آئی۔ اس کونسل کے فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ آرمینیا کی قومی کونسل کے ساتھ مل کر اسقف اعظم کے کاموں کی نگرانی کرے اور اُسے ضروری مشورہ دیا کرے۔ پھر ۶ مارچ ۱۸۴۷ء کو سلطان نے ایک اور فرمان جاری کیا اور آرمینیوں کو کچھ مزید مراعات عطا کی گئیں ان مراعات کی بدولت اہلِ آرمینیا کو ترقی کرنے میں مدد ملی۔ آخر ۱۹۱۶ء میں ترکوں کی ینگ پارٹی (اصلاح پسند جماعت) نے اہلِ آرمینیا کو سلطان ترکی کی سیادت میں ایک علیحدہ قوم تسلیم کر لیا اور انہیں اپنے اندرونی انتظامات میں کامل آزادی مِل گئی ؂

لیکن سلطان عبدالمجید خان کے دورِ حکومت میں ترکی کا رویہ کچھ جارحانہ سا ہو گیا اور ملک میں کچھ بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ تاہم آرمینیا والے پہلے کی طرح اپنے علاقوں میں بلاخوف و خدشہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اُنیسویں صدی کے اخیر میں سیاسی فضا کچھ اس طرح بگڑی کہ آرمینیا میں شورش اور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور یورپ آرمینیا کی مدد کے لئے ایک ناخواندہ مہمان کی طرح میدان میں آموجود ہوا۔ یورپ نے آرمینیا کی حمایت جس ڈھنگ سے کی۔ ترک اس سے اور بھڑک اُٹھے کیونکہ دول یورپ جو چالیں چل رہے تھے اس میں ترکوں کی قومی تخریب کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ اس لئے یورپ کی یہ معاندانہ روش ترک کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی فضا صاف ہونے کی بجائے اور بھی مکدّر ہو گئی۔ اسی اثنا میں ترکوں نے سلطان عبدالحمید خان کو تختِ خلافت سے بے دخل کر دیا۔ اس سے ترکوں اور اہلِ آرمینیا میں صلح صفائی ہو جانے کا رہا سہا امکان بھی جاتا رہا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آرمینیا کے اکثر بارسوخ آدمی پھر زار کی حکومت کا دم بھرنے لگے تھے اور روس بھی اپنے پُرانے ہتھکنڈوں سے کام لے رہا تھا اور آرمینی لیڈروں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اپنے جال میں پھانس رہا تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اہلِ آرمینیا جو کوہ قاف کے رُوسی علاقوں میں آباد تھے۔ اپنے ان بھائیوں کی نسبت جو ایشیائے کوچک میں بستے تھے۔ زیادہ خوشحال تھے کیونکہ روسی منڈیوں میں آرمینیوں کی ساکھ اچھی تھی۔ لیکن

"ایشیائے کوچک" میں ترک اور ارمینی دونوں گھاٹے میں تھے۔ کیونکہ سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت نے تیس سال تک ان لوگوں کو آرام کا سانس نہ لینے دیا۔ لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے ہم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو آزادی اہل آرمینیا کو عثمانی تاجدار کے ماتحت اس دور میں بھی حاصل تھی حکومت روس کے ماتحت اس کا دسواں حصہ بھی کبھی ان کو نصیب نہ ہؤا۔ خرس روس کا جب پنجہ مضبوط ہؤا۔ تو سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں زار کی حکومت نے تمام ارمینی مدارس بند کر دئیے۔ کلیسا کے نام جس قدر املاک تھیں سب ضبط کر لیں۔ حالانکہ ۱۸۳۶ء میں ارمینی کلیسا سے زار کی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جائداد جو کلیسا کی ملکیت ہو گی۔ حکومت روس کو اس سے کچھ سروکار نہ ہو گا۔ قاف کے روسی علاقوں میں جس قدر اہل الرائے ارمینی تھے۔ سب جیلوں میں ٹھونس دئیے گئے۔ ۱۸۹۰ء میں ارمینیا کی انقلابی انجمن بالکل نیست و نابود کر دی گئی۔ لوگوں کے حقوق ملکیت چھین لئے گئے۔ ارمینی زبان میں تعلیم جرم قرار دی گئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک ارمینیوں کی روس کے ہاتھوں یہ درگت بنتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ ٹفلس میں ارمنی میں تقریر کرنا بھی جرم تھا۔ حالانکہ ٹفلس ارمینیا کا صدر مقام تھا۔ یہ سلوک اس قوم سے کیا گیا۔ جس نے ہر موقع پر حکومت زار کے وعدوں پر اعتبار کیا اور وقت پڑے پر ہمیشہ فوجی مدد کی یعنی ع

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا!

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو مظالم سلطان عبدالحمید خاں کے سر تھوپے جاتے ہیں ان کا اصلی ذمہ دار وہی سلطنت روس کا وزیر خارجہ "پرنس لوبناف

روسٹوسکی" تھا جو کبھی سلطان عبد الحمید کا بھی بڑا معتمد اور مشیر تھا اور جس کی پالیسی صرف یہ تھی کہ آرمینیوں کو ترکوں کے خلاف اُبھار کر سلطنت ترکی کے وقار کو صدمہ پہنچایا جائے؂

جاپان اور رُوس کی آویزش کے بعد جب رُوس کو زک اُٹھانی پڑی تو ان حالات میں قدرتی طور پر تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ سیاسی مقاصد نے رُوس کو پھر مشرقی معاملات کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ مشرق میں اصلاحات نافذ کرنے کا ڈھونگ رچا کر ایشیائے کوچک میں بسنے والے عیسائیوں کا نجات دہندہ بن بیٹھا۔ حالانکہ سب سے زیادہ نجات کی ضرورت خود اُن عیسائیوں کو تھی جو سلطنت روس میں آباد تھے۔ اور زار کے جبر و استبداد نے ان غریبوں کا ٹینٹوا دبا رکھا تھا۔ اور کسی کو زبان شکوہ وا کرنے کی بھی اجازت نہ تھی یعنی بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

مشرق بعید میں جاپانیوں سے پٹنے کے بعد روس کو بھی ہوش آگیا۔ اور اُسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کوہ قاف کے علاقوں میں جو جور و ستم اُس نے کیا ہے اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بن کر چمک رہا ہے۔ اب ترکی میں بسنے والے آرمینیوں کو رام کرنے کی چونکہ سیاسی ضرورت پھر ایک بار محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے زار نے قاف کے گورنر جنرل "کونٹ ورنزوف ڈچکوف" کے مشورے سے ارمنی کلیسا کی جس قدر جاگیریں ضبط کی تھیں سب واگذار کر دیں اور ارمنی مدارس از سر نو جاری کر دیئے گئے اور اہلِ آرمینیا

کے اکثر مطالبات منظور کر لئے گئے لیکن یہ سب چالیں محض اس لئے چلی گئیں کہ ایشیائے کوچک میں روسی پالیسی فروغ پائے اور پہلے کی طرح اہلِ آرمینیا روس کے معاون اور مددگار بن جائیں۔ روس کی چالیں یہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ ارمینیوں کو پھر ایک بار ایشیائے کوچک میں ارمینی سلطنت کے قیام کے سبز باغ بھی دکھائے جانے لگے۔ اور چند ہی سال کے بعد "کونٹ ارنزوف ڈچکوف" نے زار کو مطمئن کر دیا کہ اہلِ آرمینیا پرانی شکایتیں بھول کر پھر سلطنت روس کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں ؛

کچھ عرصہ بعد (روسی پارلیمنٹ) "ڈیوما" میں ایک آرمینی رکن پارلیمنٹ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ زار کی حکومت ترکی کو آرمینیوں کو اصلاحات عطا کرنے پر مجبور کرے لیکن اس قتل عام کا ذکر کرنے کی کسی اللہ کے بندے کو جرات نہ ہوئی۔ جب زار کے اشارے سے مسلمانوں کے خاندان قتل کر دیئے گئے تھے پہلے کاکیشیا کے مسلمانوں کو آرمینیوں کے خلاف بھڑکا کر کشت و خون کرائے گئے اب آرمینیوں کو مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اور سادہ لوح آرمینی دھوکے میں آ کر زار کی چال کا شکار ہو گئے ؛

---

(۳)

ترکوں نے جب ایشیا میں فتوحات حاصل کیں تو ان کا ہمیشہ سے یہی رویہ رہا کہ وہ کسی قوم کے مذہبی یا معاشرتی معاملات میں دخل نہ دیتے۔ یہی پالیسی انہوں نے

بازنطینی سلطنت کے جو علاقے فتح کئے وہاں بھی قائم رکھی اور اسی مصالحانہ اور فیاضانہ پالیسی کی بدولت مفتوح اقوام بلاچون وچرا ترکوں کی حلقہ بگوش ہوتی گئیں لیکن یہ پالیسی ترکوں کو راس نہ آئی۔ کیونکہ وہ تو اپنی فتوحات پر مطمئن بیٹھے تھے۔ ادھر دُنیا معاشرتی اور اقتصادی ترقی کر رہی تھی۔ لیکن جب ترکوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور مشرق کے عیسائی یورپ کی طرف مائل ہو چکے تھے اور یورپ جو اس قسم کے مواقع کی تاک میں ہمیشہ رہتا تھا۔ اس نے ترکوں کی اس غیر مآل اندیشی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ؛

زار اور اس کے ساتھ تمام یورپ کی یہی پالیسی تھی۔ کہ ترکوں کو ہر طریق سے کمزور کیا جائے اور جب موقع ملے سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ حاصل کیا جائے لیکن بظاہر ترکوں سے ہمدردی ظاہر کر کے انہیں سلطنت ترکی میں اصلاحات رائج کرنے پر آمادہ کرتے رہیں۔ ترکوں کے خلاف چُھپکے چُھپکے جو سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ سب ریکارڈ روس کے سرکاری دفاتر میں ابھی تک موجود ہے ان سازشوں کا لب لباب صرف یہ تھا کہ ترکوں کو کبھی سنبھلنے نہ دیا جائے کیونکہ ترکوں کا طاقتور ہونا زار کے مفاد کے خلاف تھا اور یہ مفاد کیا تھا۔ ترکی پر قبضہ ! ان حالات کی موجودگی میں اصلاحات جاری کرنا تو رہا ایک طرف ترکوں کی ہستی ہی خطرے میں تھی آخر ترکوں نے تنگ آکر یورپ سے مدد مانگی۔ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۸ء تک یورپ نے ترکوں کی مدد کر کے انہیں خرس رُوس کے پنجہ سے بچایا۔ اور جب مدحت پاشا جیسے محب الوطن نے ترکی میں اصلاحات کا کام جاری کر دیا تو بدقسمتی سے عبد الحمید خاں کی حکومت نے پھر ایک بار اس مفید کام کو پس پشت ڈال دیا ؛

پاس کوہستان آرارات کے پاس جا نکلتی ہے اور مشرق کی جانب کوہستان آرارات کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا ایران میں کرمان شاہ سے جا ملتا ہے اور جنوب اور مغرب کی جانب کرمان شاہ سے ملتا ہوا موصل اور دیار بکر کی سمت سے پھر آذربائجان پر آکر ختم ہو جاتا ہے اس حدود بندی میں کہیں کہیں آرمینی علاقے بھی نظر آتے ہیں یعنی آرمینیا اور کردستان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اس لئے یہ بتلانا سخت مشکل ہے کہ آرمینیا کہاں ختم ہوتا ہے اور کردستان کہاں سے شروع ہوتا ہے ✣

رہی کردوں کی آبادی تو اس میں بہت اختلاف ہے کیونکہ جس قدر آبادی ظاہر کی جاتی ہے اس سے کم از کم دگنی آبادی ضرور ہے لیکن اگر اس آبادی کی اوسط نکالی جائے تو کردوں کی آبادی تین ملین (تیس لاکھ) سے کم نہیں جس میں سے دو ملین ترکی میں آباد ہیں۔ سات لاکھ ایران میں اور تین لاکھ روس میں آباد ہیں۔ لیکن پھر بھی جن لوگوں کو کردستان کی سیر و سیاحت کا موقع ملا ہے وہ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ یہ اعداد و شمار بھی اصلی تعداد سے کم ہیں اسی طرح آرمینی جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ ان کی آبادی کا تخمینہ تیس لاکھ کیا جاتا ہے جس میں سے تیرہ لاکھ ترکی میں۔ گیارہ لاکھ روس میں۔ ایک لاکھ ایران میں آباد ہیں اور نصف ملین یعنی پانچ لاکھ کے قریب امریکہ۔ مصر۔ پولینڈ۔ رومانیا اور بلغاریہ میں آباد ہیں۔ ایشیائے کوچک میں قومیت کے لحاظ سے یہ کسی جگہ

بھی مجتمع نظر نہیں آتے اور یہی ان کی کمزوری کی ایک بڑی وجہ بھی ہے"۔

لیکن صرف ترکی ہی ہیں جس قدر آرمینی آباد ہیں۔ ان کی سوشل ترقی کا اندازہ ذیل کے اعداد شمار سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں ان کے ۸۰۳ مدارس تھے۔ جن میں آرمینی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ان ۸۰۳ مدارس میں ۲۰۸۸ اُستاد تھے۔ ۵۹۵۱۳ طلبا اور ۲۷۱۳ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اور تجارتی نقطۂ خیال سے بھی ان لوگوں کی حالت قابل رشک تھی۔

لیکن یہ قیاس کر لینا کہ کُرد زبردستی آرمینی علاقوں میں گھُس آتے تھے محض غلط ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں قومیں برسوں سے مل جل کر رہتی تھیں لیکن کُردوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے انہیں بھی کچھ تواریخی اہمیت حاصل ہو سکے۔ ہاں اُنہوں نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا۔ اور ان کی تقلید میں اکثر آرمینی قبائل بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

گو کُردوں اور آرمینیوں میں فسادات سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں شروع ہوئے لیکن واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ برسوں سے دونوں میں مذہبی منافرت چلی آتی تھی۔ کُرد سردار اپنے آرمینی مزارعہ پر جبر و تشدد کرتے تھے لیکن عوام الناس صلح اور آشتی سے رہتے تھے۔ اسی طرح کُرد عوام بھی اپنے سرداروں کے ہاتھوں سے نالاں تھے۔ یہ سردار اپنی رعیت سے خواہ وہ کُرد ہوں یا آرمینی اپنی اراضیات

کاشت کراتے تھے اور اس کے عوض میں کاشت کار کو معمولی سا معاوضہ دے دیتے تھے لیکن کرد سرداروں میں ایک وصف بھی تھا یعنی وہ اپنے کاشتکاروں کو دوسری قوموں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھتے تھے۔ اور اگر کوئی کرد سردار کسی ارمینی علاقہ پر جبر و تشدد کرتا تو دوسرے کرد سردار اس کے مقابلے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ یہ کرد سردار "آغا" کہلاتے تھے لیکن جب عثمان پاشا نے کردستان فتح کیا تو آرمینیوں کو بہت سی مراعات حاصل ہو گئیں اور آرمینی بھی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے ۔

ٹزارزکی لکھتا ہے :۔

"جب سلطان عبدالحمید خاں کو عہد نامہ برلن کے بعد سلاطین یورپ نے آرمینیا میں اصلاحات کا کام شروع کرنے پر مجبور کیا تو سلطان نے اس تحریک کو روکنے کے لئے کردوں کو جو پہلے ہی سے آرمینیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر برافروختہ ہو رہے تھے اُبھارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرمینیا میں شورش پیدا ہو گئی اور کردوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا میدان گرم کر دیا ۔

سلطان عبدالحمید خاں کی یہ سیاسی چال اس قدر کامیاب ہوئی کہ آرمینیا کو مراعات عطا کرنے کا سوال پھر کھٹائی میں پڑ گیا اور کرد اور ارمینی جو صدیوں سے امن سے رہتے چلے آرہے تھے ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے لگے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ فرقہ دارانہ نفرت اور عداوت بھی زیادہ زور پکڑتی گئی " ۔

لیکن باوجود ان فسادات کے پھر بھی کُردوں اور آرمینیوں کی اکثریت ترکوں کے ہی زیرِ سایہ رہنا پسند کرتی تھی - اور اسے کسی صورت میں رُوس کی رعیت ہونا گوارا نہ تھا - کُرد چونکہ اسلام کے حلقہ بگوش تھے اس لئے قدرتی طور پر انہیں رُوس کے ماتحت رہنا پسند نہ تھا اور ارمینی کلیسا رُوس کے جبر و تشدد سے نالاں تھا - اسی طرح مذہبی تخالف کے باعث دونوں کو ملا کر ایک ریاست قائم کرنا خارج از بحث تھا ؛

سلطان عبد الحمید خان کے عہد میں "کُرد رسالے" بہت مشہور تھے - جب ضرورت ہوتی ان کی خدمات مستعار لے لی جاتیں چونکہ یہ لوگ اپنے علاقوں میں بالکل آزاد تھے اور ان پر کوئی بندش نہ تھی - اس لئے وہ زیادہ خطرناک بھی ہو گئے تھے - موسیو "زارنزکی" کا خیال تھا کہ اگر یہ "کُرد رسالے" سلطنت عثمانیہ کی باقاعدہ فوج میں شامل ہو جائیں تو خطرہ کا انسداد ہو سکتا ہے ؛

سب سے اہم سوال اراضیات کی تقسیم کا تھا - "کُرد آغا" زمینوں کے مالک تھے اور کاشت کار ارمینی تھے جو صدیوں سے یہ اراضیات کاشت کرتے چلے آتے تھے اور پیداوار میں سے "کُرد آغاؤں" کو دے دلا کر بھی ان کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ بچ جاتا اسی وجہ سے یہ لوگ خوشحالی سے بسر اوقات کرتے تھے لیکن جب بھی کوئی خرابی پیدا ہوتی تو اس کا الزام ترکوں کے سر تھوپا جاتا - اور علانیہ کہا جاتا کہ جب تک یہ "کُردی ارمینی" علاقے ترکوں کے قبضے میں رہیں گے فسادات کبھی ختم نہ ہونگے اس لئے یہ علاقے دول یورپ کے سپرد کر دیئے جائیں -

یا ان پر زار کی سیادت تسلیم ہونی چاہیئے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں تھیں اگر یورپ واقعی اہل آرمینیا کی ترقی کا خواہاں ہوتا تو وہ ترکی کے کام میں کبھی روڑا نہ اٹکاتا جو لوگ سیاست کے اصُول سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی قوم دُوسری قوم پر اصلاحات کا بار ڈالتی ہے تو اس کے دُوسرے معنی صرف یہی ہُوا کرتے ہیں۔ کہ اصلاحات کی بجائے موجودہ حالات بھی خراب کر دیے جائیں۔ اور بین الاقوامی مشکلات پیدا کر دی جائیں تاکہ "سیاسی معتوب" کو سنبھلنے اور اپنی حالت سنوارنے کا کبھی موقع نہ ملے۔

اس میں تو کچھ شک نہیں کہ "بے زبان" اہل آرمینیا کے کردوں کے ہاتھ سے تباہ ہونے سے یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں کی رگِ حمیت بھڑک اٹھی لیکن کاش یہی اہلِ یورپ اور امریکہ کبھی اپنے گریبان میں بھی مُنہ ڈال کر دیکھتے۔ کردوں کے مظالم ان مظالم کے مقابلے میں جو حال کی عالمگیر لڑائی میں پیروانِ مسیح نے ایک دوسرے پر کئے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ گذشتہ چالیس سال میں جس قدر آرمینی کردوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے بتلائے جاتے ہیں جنگ یورپ کے دوران میں ایک مقام پر صرف چالیس دن میں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں عیسائی عیسائیوں کے ہاتھوں سے مارے گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شاید یورپ کی شریعت میں عیسائی کا قتل عیسائی کے ہاتھوں جائز ہو۔ بقول اہل یورپ کُرد تو ازل سے جاہل۔ غیر مہذب اور ظالم واقع ہوئے ہیں۔ اور یورپ کو تو اپنی تہذیب اور تعلیم پر ناز ہے۔ کُرد لُوٹ مار اور قتل و غارت پیٹ کی خاطر کرتے ہیں لیکن

یورپ نے تو محض حرص و ہوا کی خاطر خون کے دریا بہا دئیے ‪۔‬

اور اب اگر یورپ یہ چاہے کہ کرد مہذب بن کر دوسری اقوام کے دوش بدوش ترقی کریں تو یہ کام صرف ایک اسلامی حکومت ہی سرانجام دے سکتی ہے کیونکہ کرد بھی مسلمان ہیں ‪۔‬

سر مارک سائکس نے اپنی کتاب "دی کیلفس لاسٹ ہیری ٹیج" (THE CALIPH'S LAST HERITAGE) میں ایشیا کوچک میں بسنے والی مختلف اقوام کا ذکر کرتے ہوئے اہل آرمینیا کے متعلق لکھا ہے:-

"ترکی کی اکثر عیسائی رعایا کی طرح آرمینیا کے عیسائی بھی محض ایک زعم باطل میں گرفتار رہیں اور اسی زعم باطل کے باعث ایسے ایسے کام بھی کر بیٹھتے ہیں جن کا انہیں اکثر خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے اور عموماً ایسے سیاسی جرائم ان سے سرزد ہو جاتے ہیں جو ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ اپنی حماقتوں سے یہ لوگ خود تو گرفتار بلا ہوتے ہی ہیں لیکن عموماً ناکردہ گناہ کو بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جہاں ذاتی انتقام کا سوال ہو یہ لوگ ملکی اور ملی مفاد کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایسے شخص کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں جو دل سے ان کا خیرخواہ اور ہمدرد ہوتا ہے۔ ازل سے ہی آرمینیا کی قسمت میں غلامی لکھی ہے اور اس غلامی کے ذمہ دار وہ حکمران ہیں جن کے ماتحت یہ آباد ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ اپنے طرز عمل سے یہ لوگ ہر کس و ناکس کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں ‪۔‬

وان میں جب قحط پڑا تو آرمینی سوداگروں نے اتنی سنگدلی دکھائی کہ فوراً
اِدھر اُدھر سے غلہ سمیٹنا شروع کر دیا تاکہ بعد میں منافع پر فروخت کر سکیں۔
آرمینیا کی انقلابی جماعت کا یہ حال ہے کہ اپنوں پر ہی ہاتھ صاف کرنا
اپنا قومی کارنامہ تصور کرتی ہے ❊

قسطنطنیہ کے ارمینی انارکسٹوں نے حکومت کے بعض ارکان پر محض اس
لئے بم پھینکے کہ حکومت مشتعل ہو کر انہی کے بھائی بندوں سے انتقام
لے۔ اس طرح یہ لوگ اپنوں کی غمازی کر کے قوم سے غداری کرتے رہے
جہاں تک آرمینیا کے دیہاتی باشندوں کا تعلق ہے ایک گاؤں دوسرے
گاؤں والوں کا دشمن ہوتا ہے ایک انقلابی پارٹی دوسری انقلابی پارٹی
کے خون کی پیاسی ہوتی ہے۔ پادری اپنے بشپ کے قتل کے منصوبوں
میں لگے رہتے ہیں اور ارمینی کلیسا کا اختلاف تو دُنیا سے کوئی چھپی ہوئی
بات نہیں ❊

انقلابی انجمنوں کا سب سے بڑا کام قتل و غارت ہے اور سفاکی اور
بے رحمی میں ان کا جواب نہیں۔ مسلمانوں کو قتل اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ
ان کے ہی بے گناہ بھائی بند پھانسی پائیں۔ جن لوگوں سے ٹیکس وصول
کیا جاتا۔ رات کی تاریکی میں انہی لوگوں کے گھر لوٹ لئے جاتے —
وہ لوگ جو ان ناپاک سازشوں کے لئے انہیں چندہ نہیں دیتے انہیں
کسی نہ کسی بہانے قتل کر دیا جاتا ہے ❊

مسلمان ارمینی کلیسا اور کیتھولک مذہب کے پیروؤں کے نزدیک

آرمینیا کی ان انقلابی انجمنوں کا وجود ملک کے امن اور خوشحالی کے لئے
ایک خوفناک رکاوٹ ہے۔ ہر کوئی ان کو تباہ کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔"

اسی طرح ایک اور جگہ بھی سر مارک سائکس لکھتے ہیں :-
"ایشیا کوچک کے حالات کو بہ نظر غور دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ اہل اسلام اور پیروان مسیح کے تعلقات دن بدن کشیدہ ہوتے چلے
جاتے ہیں۔ اس فتنہ کا صرف ایک ہی علاج نظر آرہا ہے یعنی دونوں میں
سے ایک قوم کو اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔ اور اگر کوئی یہاں خلوص
نیت سے اصلاحات جاری کرنا چاہے تو اُسے سب سے پہلے "پادریوں"
اور "ملاؤں" کو جیل کی زنجیریں جکڑنا ہو گا۔"

سر مارک سائکس کا خیال ہے کہ موجودہ تعلیم نے فائدہ کی بجائے ان لوگوں کو اُلٹا
بھی نقصان پہنچایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں ایک دوسرے پر "اعتماد
کی سپرٹ" پیدا کی جائے۔ اور ایک ایسی زبردست پولیس مقرر کی جائے جو بلا امتیاز
ملت و مذہب فتنہ پردازوں کو عبرت ناک سزائیں دیں۔

---

(۴)

آرمینیا میں جو بدنظمی رہی اور وقتاً فوقتاً کشت و خون بھی ہوتے رہے۔ اس کے
ذمہ دار زیادہ تر مقامی حکام تھے۔ جو ان فسادات سے بہت مالی فائدہ حاصل

کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید خاں کا عہد جو زیادہ تر مصائب کا زمانہ تھا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ دیانت دار حکام کی کمی تھی ؞

سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے گو بہت کچھ حالت کو سدھارا لیکن جہاں تمام یورپ اس بات پر تُلا ہو کہ سلطنت عثمانیہ میں ابتری اور بدنظمی پھیلائی جائے وہاں مٹھی بھر مخلص کام کرنے والوں کی کیا پیش جا سکتی تھی۔ ملک میں جس قدر اصلاحی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ بیرونی اثر یا مداخلت انہیں ملیامیٹ کر دیتی تھی کیونکہ یورپ نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ جس طرح بھی ہو سلطنت ترکی کو کمزور کر دیا جائے۔ اور بدنام کیا جائے۔ ترکوں نے سیاسی انقلاب کے لحاظ سے تو بہت کچھ حاصل کر لیا ہے لیکن اب یہاں ایک معاشرتی انقلاب کی بھی سخت ضرورت ہے اور یہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک دُنیا میں مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی سلطنت قوت اور طاقت نہ حاصل کرے اور اغیار کے دانت کھٹے کرنے کے قابل نہ ہو جائے ؞

ترکی میں جو انقلاب ہُوا۔ اس میں بھی رُوس کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ سلطنت ترکی کا مضبوط ہونا روس کے مفاد کے خلاف تھا اور روس یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ کہ مشرق میں ترک پھر اپنی تنظیم کر لیں۔ گو ترکوں سے اس دَور میں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جس کے باعث دولِ عظام کو بھی اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ ترکوں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ترکوں کی ناتجربہ کاری سے رُوس اور دیگر مغربی حکومتوں نے بھی خوب

فائدہ اُٹھایا اور "ینگ ترکش پارٹی" کو اپنے اصلاحی پروگرام میں ناکام بنانے کی بھی پُوری پوری کوشش ہوتی رہی۔ یورپ نے ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی کو دُنیا کی نگاہ میں بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور وہ سیاسی مسائل جو سلطان عبدالحمید خان کے وقت سے اُلجھے ہوئے تھے انہیں سلجھانے کا کوئی موقع نہ دیا ٭

ادھر مشرق میں جو آگ بھڑک رہی تھی۔ اہلِ مغرب اگر چاہتے تو یہ آگ زیادہ نہ پھیلتی اور اگر یورپ کی نیت صاف ہوتی تو وہ ترکوں کو سہارا دے کر اس قابل بنا سکتے تھے کہ ترک بھی اقوام عالم کے دوش بدوش ترقی کرنے کی دیرینہ آرزو پوری کر سکیں ٭

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے لیڈر یورپ میں جہاں کہیں بھی گئے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن روس کے ایجنٹ بھی غافل نہ تھے۔ مشرق میں جو سیاسی حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ وہ انہیں مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ زار کو کاکیشیا کے مسلمانوں کے بیدار ہو جانے کا اندیشہ تھا اور مشرق میں عیسائیوں کے ترکوں سے مرعوب ہونے کا بھی فکر لگا ہُوا تھا ٭

روس کی آرمینیا کے متعلق آج بھی وہی پالیسی تھی جو کسی زمانے میں بلغاریہ کے متعلق اُس نے اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن بلغاریہ کا راستہ بند ہو جانے سے قسطنطنیہ جانے کا آسان راستہ بھی اس کے لئے مسدود ہو چکا تھا۔ باسفورس تک پہنچنے کے لئے ایک بحر اسود کا راستہ ہی رہ گیا تھا۔ اس کا ایک ہی علاج تھا یعنی آرمینیا میں کبھی امن نہ ہونے پائے۔ اور زار ترکوں کے خلاف ان مظلوموں

کا روایتی نجات دہندہ بنا رہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کردوں اور آرمینیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ آرمینیا میں جہاں جہاں روس کے ایجنٹ تھے۔ وہ آرمینیوں کو بلاقیمت اسلحہ اور گولہ بارود دیتے تھے۔ اور کردوں کو بھی ہاتھ میں رکھتے تھے کیونکہ کرد بھی ترکی کی نئی تنظیم کے اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ حکومت نے ان کے بہت سے حقوق سلب کر لئے تھے۔ اور آرمینیا والوں کو کچھ مراعات عطا کر دی تھیں۔

لیکن وہ انگریز سیاح جو جنگ بلقان کے بعد ایشیائے کوچک میں گئے انہوں نے روس کی یہ چال ایک دنیا پر ظاہر کر دی۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر والٹر گینس ممبر پارلیمنٹ نے بہت سا وقت کردا ور آرمینی علاقوں میں محض ان حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے گزارا۔ اور جنوری ۱۹۱۴ء میں "نیشنل ریویو" میں اپنے مشاہدات شائع کرائے۔

مسٹر والٹر گینس نے ان مضامین میں یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ انقلاب ترکی کے بعد پانچ سال کے عرصہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز کردوں اور روسی نمائندوں کی دوستی تھی۔ چنانچہ مسٹر والٹر گینس لکھتے ہیں :-

"سب سے زیادہ تعجب خیز بات جو میں نے دیکھی وہ کردوں اور روسیوں کا اتحاد تھا باوجودیکہ ترکی حکومت کی طرف سے ان لوگوں پر کسی قسم کی فوجی پابندی عائد نہیں۔ تاہم یہ لوگ ترکوں کے خلاف نظر آتے تھے۔ اکثر کردوں کو میں نے روس کی بنی ہوئی رائفلوں سے مسلح دیکھا۔"

ایک کردی گاؤں میں میں نے ایک رُوسی کو بالکل کردی لباس میں کُردوں کے ساتھ مِل جُل کر رہتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ یہ شخص رُوس سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہے گو کبھی کبھی ایک رُوسی افسر سے جسے رشتہ میں اپنا بھائی بتلاتا ہے مِل کر روپیہ بھی لیتا رہتا ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ایک مہذب رُوسی کا ان جاہل کردوں میں مِل جُل کر رہنا خالی از علّت نہیں"

اپریل ۱۹۱۳ء میں یورپ نے پھر ترکوں کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور یورپ کے اخبارات "آرمینیوں کے قتل کا خطرہ" کے عنوان جلی حروف میں شائع کرنے لگے۔ اور حکومت روس کے ایجنٹ من گھڑت بیانات اور ارض روم۔ وان اور دیگر آرمینی ترکی مقبوضات کی قومی کونسلوں کی فرضی عرضداشتوں کی بنا پر اقوامِ مغرب کو یقین دلانے لگے کہ حکومت ترکی آرمینیوں کے قتل کے منصوبے باندھ رہی ہے اور آرمینیوں کی ہستی خطرے میں ہے۔

اسی اثنا میں چند بارسوخ کُردی "آغا" یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آیا انہیں رُوس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہیئے یا اس سے الگ رہنا چاہیئے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ ایک کرد آغا جس کا نام رزاق تھا اور جو کبھی سلطان عبدالحمید خاں کا منظورِ نظر تھا۔ اور مُلک میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھتا تھا لیکن بعد میں ترکی حکومت کے خوف جس نے اس کے جرائم کی پاداش میں اس کے لئے موت کا حکم صادر کیا تھا بھاگ کر رُوس میں پناہ گزین تھا۔ اور اب ایک رُوسی ایجنٹ متصور ہوتا تھا پھر میدان میں آیا۔

اور کردوں کو روس کا ساتھ دینے پر اکسانے لگا۔ اسی طرح وہ "کرد آغا" جو اپنے اعمال کی وجہ سے ترکی حکومت سے خائف تھے۔ پھر روس کے ساتھ سازباز کرنے لگے۔ یہ سب لوگ جن میں رزاق بھی شامل تھا ٹفلس میں جمع ہوئے یہاں روسی عمال نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور کاکیشیا کے روسی گورنر جنرل نے ان لوگوں کو کردوں کے لئے بہت سے تحائف بھی دیئے یہ تحائف اسلحہ اور سامان جنگ اور نقد روپیہ کے سوا اور کیا ہو سکتے تھے۔ روس کے ایجنٹ اور کرد آغاؤں کی ان سب سازشوں کا بھانڈا ایک فرانسیسی مشن نے جو اتفاق سے اس وقت ان علاقوں میں مذہبی پرچار کر رہی تھی پھوڑا۔ اور سلاطین یورپ کو زار روس کی خطرناک چالوں سے آگاہ کر دیا۔ یہ سنہ ۱۹۱۳ء کے واقعات ہیں اور یہ واقعات اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ ایشیائے کوچک میں آرمینیوں کے قتل کی سازشیں محض روس کی انگیخت سے ہوتی تھیں تاکہ "ینگ ٹرکش پارٹی" کو انگلستان کی نگاہ میں ناقابل اعتبار ظاہر کر کے مشرق میں روس کی مداخلت کے لئے راستہ صاف کیا جائے۔

اس وقت انگلستان میں ترکوں کے ہم خیال جو لوگ تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی متحدہ کوششوں سے لندن میں ایک اینگلو ٹرکش کمیٹی قائم کی گئی۔ اس مجلس کے صدر لارڈ لمنگٹن منتخب ہوئے اس کمیٹی کا واحد مقصد یہ تھا کہ مشرق کو روس کی تباہ کن چالوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ان واقعات کے کچھ روز بعد اچانک بلقان میں جنگ و جدل کے شعلے بھڑک اٹھے اور تمام یورپ

ترکوں کی مخالفت پر تُلا ہوا نظر آنے لگا۔ اور قدرتی طور پر مسلمانانِ عالم میں ایک اضطراب سا پایا جانے لگا۔ چونکہ انگلستان بھی ترکوں کا مخالف تھا۔ اس لئے ہندوستان میں مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ کی اس مسلم آزار پالیسی کے خلاف پُرجوش احتجاج کیا۔ اِدھر انگلستان میں لارڈ بیکن فیلڈ کی پالیسی کے جو لوگ مداح تھے اور جن کی خوش قسمتی سے ابھی کافی تعداد تھی ان سب نے مل کر پیرس اور لنڈن میں ایسے موقع پر برطانیہ کا ترکوں کی مخالفت کرنے پر سختی سے اعتراض کیا۔ ادھر دربار روس تھا جو بڑی شدومد سے دول عظام کو آرمینیوں کی بیکسی کا یقین دلا رہا تھا۔ اور اس کی کوششوں سے تمام یورپ میں آرمینیا والوں کی امداد کے لئے خفیہ انجمنیں قائم ہو رہی تھیں ؞

---

۱۲ مئی ۱۹۱۳ء میں آرمینیا کی نیشنل اسمبلی نے غازی شوکت پاشا وزیر اعظم سلطنت عثمانیہ کو جب اہل آرمینیا کی بے دست و پائی کی طرف توجہ دلائی۔ تو غازی موصوف نے جواب میں فرمایا:۔

"مجھے نہ صرف تمہارے مصائب ہی کا علم ہے بلکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اور کون کون سے علاقے بدامنی کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اس قسم کے جرائم کے انسداد کا پختہ ارادہ کر چکی ہے اس موقع پر میں نہ تو کوئی لمبی تقریر کرنی پسند کرتا ہوں اور نہ ہی تم لوگوں سے کوئی وعدہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تقریریں بھی ہوتی رہی ہیں اور وعدے بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ ہاں حکومت

اپنے طرز عمل سے آپ لوگوں کو بتلا دے گی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔"

۱۹۱۳ء کے موسم بہار میں بطلیس کے روسی قنصل نے کردوں کے ایک گروہ کو رشوت دے کر اس شہر میں آرمینیوں کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ اور روس کے وزیر خارجہ کو بھی اس تمام کارروائی کی اطلاع دے دی بس اب کیا تھا آرمینیوں کے خطرے سے دول عظام کو فوراً مطلع کر دیا گیا۔ لیکن بے گناہوں کے اس کشت و خون کا صرف ایک مقصد تھا یعنی زار کو آرمینیا کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ روس کے ایجنٹ اس قسم کے ہتھکنڈے آئے دن کرتے رہتے تھے۔ لیکن عین وقت پر حکومت ترکی کو بھی خبر ہو گئی۔ اور اس نے اسی وقت فوجی کارروائی سے کردوں کی شورش فرو کر دی۔ اس سازش کا سرغنہ کردی سردار روسی علاقے میں بھاگ گیا اور بطلیس کے قنصل کے پاس پناہ لی۔ اس سازش کا جب راز طشت از بام ہوا تو روس کی وزارت خارجہ نے بطلیس کے قنصل کو جو اس سازش کا بانی تھا صرف یہ سزا دی کہ اسے دوسری جگہ بھیج دیا۔

اگر اس موقع پر بطلیس میں ارمینی قتل ہو جاتے تو روس کو ارمینیا کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جاتا اور ایشیا کوچک کا مسئلہ از سر نو سلاطین یورپ کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور آرمینیا کے طول و بلد میں پھر شورش اور فساد کے شعلے بھڑک اٹھتے۔

یہ محمود شوکت پاشا کی ہی دور اندیشی اور تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے روس کی چال کامیاب نہ ہونے دی اور یورپ کو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے سے بچا لیا۔ روس کی چونکہ ان چھ ارمنی علاقوں پر جو ترکی کے قبضہ میں تھے نظر تھی۔

اس لئے وہ ان پر قبضہ کرنے کے لئے اس قسم کی چالیں چلتا رہتا تھا *

کچھ عرصہ بعد ترکوں نے عساکر ترکی کی فوجی تنظیم کے لئے قیصر سے درخواست کی اور جرمنی نے جنرل "لیمان وان سانڈرز" کو نومبر ۱۹۱۳ء میں ترکی فوج کی تعلیم اور تربیت کے لئے بھیج دیا۔ روس نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اور یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ آرمینیا کے اُن چھ علاقوں میں جہاں ارمنی آباد ہیں آرمینیوں کی حفاظت کے لئے رُوسی پولیس کے تقرر کی اجازت دی جائے لیکن ترکوں نے رُوس کی یہ تجویز مسترد کر دی *

---

(۵)

اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لئے ترکوں کو جو قربانیاں کرنی پڑیں دُنیا سے چھپی ہوئی بات نہیں۔ مختلف مواقع پر سلاطین یورپ نے بھی ان کی وقتاً فوقتاً مدد کی۔ مثلاً ۱۸۷۸ء میں انگریزوں نے مدد دے کر ترکی کو روس کی دست بُرد سے بچایا اور قبرس کے عہدنامہ کے مطابق ۱۸۷۸ء میں ترکوں نے قبرس کا جزیرہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جس کے عوض لارڈ بیکن فیلڈ نے ترکوں کے مشرقی مقبوضات کی حفاظت کا ذمہ لے لیا *

قبرس یا سائپرس پر انگریزی تسلط ہو جانے سے حکومت برطانیہ ان تمام سلطنتوں پر دباؤ ڈالنے کے قابل ہو گئی جن کی ایشیائے کوچک پر نظر تھی۔ جب ترکوں کی ینگ پارٹی معرض وجود میں آئی۔ تو اُس نے انگریزوں سے چند

ایک ایسے ماہر آدمی مستعار مانگے۔ جو آرمینیا کے چھ علاقوں میں اصلاحات کا
کام اپنی نگرانی میں جاری کر سکیں یہ مطالبہ یا درخواست عہدنامہ قبرس کی بنا پر
انگریزوں سے کی گئی تھی۔ سرایڈورڈ گرے وزیرخارجہ انگلستان نے اس وقت
تو یہ درخواست منظور کرلی لیکن کچھ روز بعد ترکوں کو معلوم ہو گیا کہ انگریز اسے
عملی جامہ پہنانے کا ارادہ نہیں رکھتے ؎

یکم جولائی ۱۹۱۳ء میں دارالعوام میں جب ترکوں کی اس درخواست کے
متعلق استفسار کیا گیا تو وزارت خارجہ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ حکومت عثمانیہ
نے برطانیہ سے درخواست تو کی تھی لیکن جب تک اس مسئلہ پر کافی غور نہ کر لیا جائے
ترکوں کو کچھ جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعہ کے کچھ روز بعد فرانس کا پریذیڈنٹ
موسیو پوانکرے لندن گیا۔ پوانکرے کے متعلق یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔
کہ آیا وہ زار کے اشارے سے گیا یا اپنی سلطنت کی طرف سے لیکن یہ ایک حقیقت
ہے کہ موسیو پانکرے کے صلاح مشورہ سے ترکوں کی یہ درخواست کھٹائی میں
پڑ گئی۔ روس جو ان چھ علاقوں کا بزعم خود حقدار بنا ہوا تھا۔ اصلاحات کا کام
کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ روس کے نقطہ
خیال سے یہ روسیوں کا حق تھا کہ ایشیائے کوچک میں اصلاحات کا کام ان کے
سپرد کیا جائے لیکن یہ بات ترکوں کو منظور نہ تھی۔ چنانچہ ترکی کے وزیر مال
نے ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء میں انگلستان کے مشہور روزنامہ ٹائمز میں لکھا :-
"ہم آرمینیا کو دوسرا مقدونیہ ہرگز بنانا نہیں چاہتے اور اگر انگلستان

یا فرانس نے ہمیں ایسے ماہر جو اصلاحات کا کام جاری کر سکیں۔
مستعار نہ دیئے تو بھی یہ کام ہم روسیوں کے سپرد ہرگز نہیں کرینگے
اور اگر ضرورت ہوئی تو دول عظام سے مدد کی درخواست کریں گے۔"

ان سب واقعات سے صاف عیاں ہے کہ ترکوں کے دل میں گو روس کی طرف سے ایک خوفناک بدظنی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر بھی اُنہوں نے رُوس سے سمجھوتا کرنے کی ایک اور کوشش کی چنانچہ ترکی کے وزیر مال جاوید بے اور رُوسی سفیر مقیم قسطنطنیہ میں چھ سات مہینے تک اس کے متعلق گفت و شنید ہوتی رہی لیکن رُوس کے مطالبات ترکوں کے لئے ہرگز قابل پذیرائی نہ تھے ؛

لیکن اس ناکامیابی کے بعد بھی ترکوں نے ایک اور کوشش کی اور ینگ پارٹی نے جنگ سے تین مہینے پیشتر یعنی مئی ۱۹۱۴ئہ میں زار کے پاس ایک وفد بھیجا۔ اس وفد کا سردار ترکی کا مشہور محب وطن طلعت پاشا تھا۔ طلعت پاشا نے ہر ممکن طریق سے زار کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ ترک روس کی دوستی کے دل سے خواہاں ہیں۔ بشرطیکہ روس ترکوں سے ایسے مطالبات نہ کرے جو سلطنت عثمانیہ کے مفاد کے خلاف ہوں۔ چنانچہ روس کے وزیر خارجہ نے روسی ڈیوما (پارلیمنٹ) کے اجلاس میں جو ۲۳ مئی کو منعقد ہوا اپنی تقریر کے دوران میں کہا :-

"ترکی وفد سے جو گفت و شنید ہوئی ہے اس سے حکومت روس کو بھی اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ ترک دل سے رُوس کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا اتحاد جس سے دونوں سلطنتوں کے مفاد کو

کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے ۔ اور جو سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے
دونوں کے لئے قابلِ تسلیم بھی ہو۔"

ترکوں نے اپنے ملک کی ہستی برقرار رکھنے کو ہر چند روس سے اتحاد ہو جانے کی کوشش کی اور قسطنطنیہ میں روس اور ترکی کے تعلقات خوشگوار بنانے کے لئے ایک کمیٹی بھی بنادی۔ لیکن زار اور اس کی حکومت اپنی پالیسی پر برابر قائم رہی اور ترکوں کے خلاف پراپیگنڈہ کے کام میں کوئی کمی نہ ہونے دی اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ قیصر بھی ترکی کے حصے بخرے کرنے کی سکیم پر غور کرنے لگا کیونکہ نومبر ۱۹۱۲ء میں لولی برگاس کی جنگ کے بعد جرمنی کی پالیسی بھی ترکوں کے خلاف ہو گئی تھی اور جرمنی کے وزیر خارجہ اور اس کے رفیقوں کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ جہاں روس اور برطانیہ ایسے طاقتور حریف موجود ہوں وہاں اکیلے جرمنی کے لئے ترکوں کی خیر منانا آسان نہیں۔ جرمنی کو امید تھی کہ جب ترکی کے حصے بخرے کرنے کا وقت آئے گا تو جرمنی کا حصہ بھی اُسے دیا جائے گا۔ لیکن کڈرس واشٹر وزیر خارجہ جرمنی کے مرنے کے بعد جرمنی کے دوسرے سیاست دانوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ اگر ترکی کے حصے بخرے کرنے کے بعد لوٹ کا کچھ حصہ جرمنوں کو ملا بھی تو وہ زیادہ عرصہ تک ان پر قابض نہ رہ سکیں گے اور ان علاقوں میں نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے اس کے بیڑے کو یورپ کا تمام بحری راستہ عبور کرنا پڑے گا۔ اسی لئے ۱۹۱۳ء کے موسم بہار تک جب روس ابھی آرمینیا کی گتھی سلجھانے کی فکر میں تھا۔ جرمنی ترکوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکی ؁

نومبر ۱۹۱۴ء میں جب جنگ بلقان کے دوران میں قسمت کا پاسہ ترکوں کے خلاف پڑا تو حکومت رُوس نے مرتے کو مارے شاہ مدار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اہلِ آرمینیا کو بھی ترکوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ چنانچہ ۲۱ نومبر ۱۹۱۲ء کو وان کے رُوسی قنصل نے اپنی حکومت کو اطلاع دی کہ تمام ارمنی قبائل روس کے ساتھ ہیں اور رُوسی فوج کا خیر مقدم بخوشی کرینگے۔ اسی طرح بازید کے روسی قنصل نے رُوسی سفیر مقیم قسطنطنیہ کو بذریعہ تار یہ اطلاع دی :-

"تمام ارمنی قبائل ترکوں کے خلاف ہیں اور دل سے اس بات کے آرزومند ہیں کہ آرمینیا کا سلطنت رُوس سے الحاق کر لیا جائے۔"

روسی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے بھی روسی وزیر خارجہ کو اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی بہت ترغیب دی۔ اور یہاں تک لکھا کہ ایسا موقع پھر مشکل ہی ملے گا۔ اس کے جواب میں سازونو نے جو اس وقت رُوس کا وزیر خارجہ تھا اپنے سفیر کو اطلاع دی کہ اگر ہماری سرحد کے آس پاس کے علاقوں میں بدامنی پھیل گئی تو پھر ہمیں ترکی سے مجبوراً کچھ نہ کچھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا یا ممکن ہے کہ ترکی اور رُوس کے تعلقات پہلے سے بھی زیادہ کشیدہ ہو جائیں اور رُوس کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس بیان کے باوجود ترکی اور رُوس کے تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے روسی عہدہ داروں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ رُوسی سفیر نے اپنی حکومت کو اطلاع دی کہ لندن اور پیرس میں جو آرمینیوں کی انجمنیں ہیں اُنھوں نے فرانس اور انگلستان سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ دول عظام کو اہل آرمینیا کی حفاظت پر آمادہ کریں۔ یا آرمینیا کا مسئلہ زار کے سپرد کر دیں ❖

اِدھر سازونو نے ۱۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو یورپ میں اپنے سفیروں کے نام ایک خفیہ مراسلت بھجوائی اور لکھا کہ وہ اہلِ آرمینیا جو ترکوں کے زیرِ سایہ رہتے ہیں حکومت رُوس سے ایشیائے کوچک کے چند آرمینی علاقوں پر زبردستی قبضہ کرنے کی التجائیں کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ فوراً برطانیہ اور فرانس کے وزراء سے مشورہ کرکے اسے اطلاع دیں۔ علاوہ بریں اس نے فرانس اور برطانیہ سے بھی یہ درخواست کی کہ قسطنطنیہ میں رُوسی سفیر کے نقطۂ خیال کی تائید کریں ؎

اسی اثنا میں حکومت عثمانیہ نے آخرکار ان چھ ارمنی علاقوں میں اصلاحات کا کام جاری کرنے کا ایک پروگرام تیار کرلیا۔ اور ان علاقوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے دونوں کے نظم ونسق کے لئے ایک ایک انسپکٹر جنرل مقرر کیا اور انسپکٹر جنرل کے مشورے کے لئے ایک کونسل کی تشکیل ہوئی جس میں دو ارمنی نمائندے اور یورپ کے دو مشیر مقرر کئے گئے اور ان کا صدر بھی یورپ ہی کا ایک ماہرِ سیاست مقرر کیا گیا۔ رُوس کے سفیر متعینہ قسطنطنیہ نے اس موقع پر یہ تجویز پیش کی کہ کچھ رُوسی بھی اس کونسل میں شامل کئے جائیں ؎

کرسمس کے موقع پر ڈاکٹر زیوریف نے (جو ایک ارمنی ڈیلیگیٹ تھا) رُوسی سفیر کو لکھا کہ اہلِ آرمینیا کو اب یقین ہوگیا ہے کہ ان کی نجات صرف رُوس کی مدد سے ہوسکتی ہے اور ترکی کے متعلق روس سے جو ہدایات موصول ہونگی وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ زیوریف نے کھُلے الفاظ میں روس سے مدد کی درخواست کی چونکہ اہلِ آرمینیا ترکوں کی مجوزہ اصلاحات سے

مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس موضوع پر یا تو دول عظام یا صرف روس ہی ان کا اطمینان کرا دے اور وہی ان کی حفاظت کا ذمہ دار بھی ہو ؛

چنانچہ روسی سفیر نے پھر اپنی حکومت کو بذریعہ ٹیلگراف مطلع کیا کہ اہل آرمینیا کو مطمئن کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریق نہیں کہ روس ایشیائے کوچک کے ارمنی علاقوں کو اپنی سلطنت سے ملحق کرے ؛

اور کچھ روز بعد ۲۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو آرمینیا کی قومی جمعیت نے متفقہ طور پر روسی سیادت کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس وقت یورپ میں جو ارمینی رہتے تھے۔ وہ منت سماجت سے لندن میں دول عظام کے سفیروں کو اپنی حمایت پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن کاکیشیا کے روسی گورنر جنرل کو دول عظام کی اس معاملہ میں دخل اندازی مطلق پسند نہ تھی۔ اس لئے اس نے وزیر خارجہ سازونو کو تار دے کر درخواست کی کہ وہ اہل آرمینیا کو دول عظام کے سفیروں کی لندن میں کانفرنس منعقد کرانے سے روکے اور اس کے ساتھ یہ یقین بھی دلایا کہ اناطولیہ میں بھی شورش کروانے۔ بدامنی پھیلانے کا پروگرام مکمل ہو چکا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ اناطولیہ میں بدامنی پھیلانے کا ذمہ دار بھی کاکیشیا کا وائسرائے تھا ؛

مارچ اور اپریل ۱۹۱۳ء میں بطلیس۔ ارض روم اور وان کے روسی قنصلوں نے پھر اپنی حکومت کو تار بھیجنے شروع کر دیئے کہ آرمینیوں کے قتل کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ادھر روس کے سفیر متعینہ قسطنطنیہ نے بھی وزیر خارجہ سازونو کو تار دیا۔ کہ بطلیس۔ ارض روم وغیرہ کے ارمنی بہت خوف زدہ ہو رہے ہیں اور

مسلمانوں اور عیسائیوں میں فساد ہو جانا ناگزیر ہے ۔

روس کی ان شاطرانہ چالوں کی تہ میں صرف ایک مقصد تھا یعنی وہ دول عظام سے ایشیائے کوچک کے ان چھ علاقوں میں جہاں ارمنی آباد تھے امن قائم رکھنے اور اصلاحات جاری کرنے کا "بین الاقوامی پروانہ" حاصل کر سکے ۔

چنانچہ ۷ رجون کو روس کے نائب وزیر خارجہ نے دول عظام کی حکومتوں کے پاس ایک گشتی مراسلہ بھجوا دیا۔ فرانس نے فوراً روس کی تجویز منظور کر لی۔ اسی طرح برطانیہ اور دیگر حکومتوں نے بھی کچھ لیت و لعل کے بعد فرانس سے اتفاق رائے کر لیا۔ اور ۹ رجون کو اتحاد ثلاثہ کے تین سفیروں نے قسطنطنیہ میں ایک کانفرنس منعقد کر کے اصلاحات کا پروگرام دول عظام کے سفیروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرتب کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ رجون کو جرمنی اور آسٹریا ہنگری نے ان تجاویز کو اس شرط پر منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ کہ ترکی کی خود مختاری پر کوئی زد نہ پڑے۔ اسی روز سازونو نے اپنے سفیر مقیم قسطنطنیہ کو لکھا کہ وہ ترکی کے وزیر اعظم سے مل کر اسے رُوس سے اتحاد کرنے کا مشورہ دے لیکن جب جرمنی کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی تو اس نے اس بنا پر اس تجویز کی مخالفت کی کہ سفیروں کی کانفرنس کو اس قسم کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ساتھ ہی جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری نے اس بات پر بھی زور دیا کہ سفیروں کی کونسل میں سلطنت عثمانیہ کا نمائندہ بھی ضرور شامل کیا جائے لیکن روسی سفیر اور رُوسی وزیر خارجہ نے اس تجویز کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اگر سلطنت عثمانیہ کا نمائندہ شامل کیا گیا تو تجویز کامیاب نہ ہو سکے گی ۔

لیکن یہ تجویز کیا تھی ؟ آرمینیوں کے وہی چھ علاقے یعنی ارض روم۔ وان۔ بطلیس۔ دیار بکرہ۔ خرپوت اور سیواس ایک ایسے گورنر جنرل کے ماتحت کر دیئے جائیں جس کے نظم و نسق میں ترکی کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہ ہو۔ اس سے کچھ روز پیشتر حکومت ترکی نے بھی اصلاحات کا پروگرام دول عظام کی اطلاع کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن روسی سفیر کو اس پروگرام سے اتفاق نہ تھا۔ ادھر جرمنی اور آسٹریا ہنگری کی یہ خواہش تھی، کہ اس پروگرام پر بھی ساتھ کے ساتھ غور کر لیا جائے ؎

جرمنی نے آرمینیا کے چھ علاقوں کو ترکوں سے لے کر ایک علیحدہ صوبہ بنانے کی مخالفت کی، اور کہا کہ اس قدر بڑے علاقے کا انتظام کرنا بہت مشکل ہو گا لیکن روس کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ اہل آرمینیا کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ یہ چھ علاقے جن میں یہ آرمینی آباد ہیں ملا کر ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ مثال کے طور پر اس نے کریٹ۔ لبنان اور رادلیمیا کے علاقوں کے نام گنوائے ؎

آسٹریا ہنگری کے نمائندے نے یہ اعتراض اُٹھایا۔ کہ ایک ایسا گورنر جنرل مقرر کرنا جس پر ترکی کی سیادت نہ ہو سلطان کی کھُلی توہین ہے۔ جرمنی نے کہا کہ کہ اس سکیم کا اس سے زیادہ اور کچھ مقصد نہیں کہ آرمینیا کا صوبہ سلطان سے چھین لیا جائے۔ لیکن روس کے نمائندے نے گورنر جنرل ہی کے تقرر پر زور دیا۔ اور انگلستان کے نمائندے نے اس کی تائید کی۔ روسی نمائندے نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ حکومت ترکی کو ہرگز یہ اختیار حاصل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ بیرونی علاقوں سے آرمینیا میں فوج بھیجے اور کسی قسم کی سیادت اہل آرمینیا پر قائم رکھے ؎

روس کی ان چالوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ترکی کو ہر ممکن پہلو سے نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔ طلعت پاشا نے یہ تجویز پیش کی کہ ترکی کے ایوان حکومت میں جو آرمینی ارکان ہیں اس معاملے میں ان کی رائے بھی دریافت کر لی جائے۔ لیکن اس کی کچھ شنوائی نہ ہوئی ؛

پھر طلعت پاشا نے یہ تجویز پیش کی کہ ترکی پارلیمنٹ میں اس وقت پندرہ ارمنی ممبر ہیں۔ لیکن پندرہ کی بجائے حکومت انہیں بیس نشستیں دے دیگی تاکہ وہ اپنے مفاد کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں۔ لیکن یہ تجویز یا پیشکش بھی رد کر دی گئی اور آخر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی ؛

اس کانفرنس کے ناکام ہونے کے بعد رُوس کے وزیر خارجہ سازونو نے ۱۹ راگست ۱۹۱۳ء کو پھر دول عظام سے آرمینیا کے متعلق گفت و شنید شروع کر دی۔ لیکن ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء کو جرمنی نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ترکوں کو کسی ایسے فیصلہ کے منظور کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جو ان کے نقطہ نظر سے ان کے مفاد کے خلاف ہو۔ نہ صرف یہی بلکہ جرمنی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کمیشن کو صرف انہی اصولوں پر بحث کرنی چاہیئے۔ جو ترکی نے اصلاحات کے متعلق قائم کئے ہوں۔ آخر بہت لے دے کے بعد ۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء کو جرمنی اور روس اس تجویز پر متفق ہو گئے کہ ارمنی علاقوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے انتظام کے لئے دو انسپکٹر جنرل مقرر کئے جائیں۔ ان دونوں کا تقرر حکومت ترکی کے اختیار میں ہوگا۔ جو انہیں ایک خاص

میعاد کے لئے مقرر کرے گی۔ لیکن انسپکٹر جنرل کے عہدہ کیلئے نام دول عظام پیش کرے گی۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی ہُوا کہ اسمبلی میں مسلمان اور عیسائی ممبروں کی مساوی نشستیں ہونگی اور یہی توازن سرکاری ملازمتوں میں بھی قائم رکھا جائیگا اور اصلاحات کے کام کی نگرانی سلطان کے ایما پر دول عظام کے سفرا مقیم قسطنطنیہ کیا کریں گے ؎

۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو حکومت ترکی نے ان تجاویز کا جواب یہ دیا۔ کہ حکومت اصلاحات کا کام تو غیر اقوام کے مشیروں کے سپرد کر دے گی لیکن سیادت ترکی کی ہی قائم رہے گی۔ رہا دو انسپکٹر جنرل مقرر کرنے کا سوال تو اس کے متعلق ترکی نے صاف صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ وہ یہ تجویز کبھی منظور نہیں کر سکتی۔ انسپکٹر جنرل ترکی اپنی مرضی کے مطابق مقرر کرے گی۔ ہاں مشیروں کا تقرر اہلِ یورپ کے صلاح مشورہ سے کیا جائے گا اور ان کے عہدے کی میعاد دس سال ہوگی لیکن ان تمام معاملات میں سلطنت عثمانیہ دول عظام میں سے صرف ایک سے صلاح مشورہ کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ حکومت نے روس کے دو مشیر لئے جانے پر بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن روسی سفیر کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ طلعت پاشا نے یہ بکھیڑا ختم کرنے کو یہاں تک کہہ دیا کہ روس چاہے۔ تو عساکر عثمانیہ کے سات ہزار سپاہی ارمنی علاقوں میں انتظام کرنے کو بھیج دے۔ تاکہ ارمنی کُردوں کی لُوٹ مار سے محفوظ ہو جائیں لیکن رُوسی سفیر اسی ضد پر قائم رہا۔ کہ عہدنامہ برلن کی رُو سے صرف روس کو ہی آرمینیا کا مسئلہ حل کرنے کا حق حاصل ہے۔ کچھ مزید گفت و شنید کے بعد ترکوں پر دباؤ ڈال کر یہ منوا لیا گیا کہ مشیر

سارے دولِ عظام کے مشورے سے مقرر کئے جائیں گے اور ترکی کے وزیر اعظم نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ غیر سرکاری طور پر دولِ عظام کے سفیروں سے یہ درخواست کیا کرے گا کہ وہ انسپکٹر جنرل کے عہدے کے لئے موزوں آدمیوں کی سفارش کریں۔ لیکن یہ درخواست ضبطِ تحریر میں نہیں لائی جائے گی محض زبانی درخواست ہو گی۔

آخر ۱۳ر جنوری ۱۹۱۴ء کو رُوسی سفیر نے وزیر خارجہ روس کو لکھا کہ اس سے زیادہ ترکوں پر زور ڈالنا مناسب نہیں کیونکہ دولِ عظام اب ہمارا ساتھ نہ دیں گے۔ چنانچہ ۷ر فروری ۱۹۱۴ء کو سازونو نے عہد نامہ پر دستخط کرنے کی اجازت دے دی اور اس کے دو مہینے بعد انسپکٹر جنرل کے عہدے کے لئے پانچ امیدواروں میں سے جو حکومت روس نے پیش کئے ترکی گورنمنٹ نے دو کا تقرر منظور کر لیا۔ ان میں سے ایک ڈنمارک کا اور دوسرا ناروے کا نمائندہ تھا۔ یہ جھگڑا رُوس کی مرضی کے مطابق ختم ہونے کے بعد ۱۶ر اپریل ۱۹۱۴ء کو ارمنی کلیسا کے اسقفِ اعظم نے اپنی تمام قوم کی طرف سے زار کا شکریہ ادا کیا۔

آرمینیا کے انقلاب پسند ہمیشہ وہی بھیڑ اور بھیڑیے کی داستانیں بنا بنا کر اہلِ یورپ کے سامنے اپنی مظلومی کا دُکھڑا روتے رہے ہیں اور ترکوں کی حکومت کے من گھڑت مظالم کے خلاف فریاد کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں ایک فرانسیسی پادری نے پیرس میں ان بیان کردہ مظالم کے متعلق جو ترکوں نے اہلِ آرمینیا پر کئے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ کہ دولِ یورپ کا کہنا ہے۔ کہ پانچ لاکھ ارمنی تلوار کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں۔ ان اعداد و شمار کی صحت کے متعلق

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ہاں ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں جو واقعات رُونما ہوئے وہ اہل آرمینیا کے لئے بہت افسوسناک تھے لیکن یہ کہنا کہ ارمنی بالکل بیگناہ مارے گئے بالکل غلط ہے اگر ۲۵ مارچ ۱۹۱۶ء کے "گزٹ ڈی لوبین" کا مطالعہ کیا جائے۔ تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آرمینیا میں جس قدر قتل و خون ہُوا۔ اس کی ابتدا ہمیشہ ارمنی انقلاب پسندوں کی طرف سے ہوئی جنہوں نے فروری ۱۹۱۵ء میں کولنز کے بے گناہ مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ پھر موشیح کے شہر میں دونوں ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلتے رہے ۰

اپریل میں ارمینی باغیوں نے وان پر مسلمانوں کو نکال کر قبضہ کر لیا۔ اور ۶ مئی کو یہ شہر روسیوں کے حوالے کر دیا اور بے شمار آرمینی فوجی خدمات کے لئے روس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے ۰

ارمنی سرداروں میں سب سے عیار "کاراکین" تھا جو کبھی ترکی پارلیمنٹ میں آرمینیا کی طرف سے ممبر تھا۔ جب ترکی اور روس کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو یہی کاراکین ارمنی رضاکاروں کا لیڈر بن گیا۔ اس ظالم آدمی نے مسلمانوں کی بہت سی آبادیاں جلا دیں اور مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ جنگ کے دوران میں گو ارض روم کی ارمینی کانگریس نے غیر جانب داری کا اعلان کر دیا تھا۔ تاہم اس غیر جانب داری کے باوجود ان لوگوں میں سے اکثر روسی اسلحہ سے مسلح نظر آتے تھے ۰

ناممکن تھا کہ اس موقع پر کُردوں جیسی جنگجو قوم خاموش بیٹھی رہتی خصوصیت

سے جب کردوں کے جذبات کو ابھارا جائے تو یہ لوگ مجسّم قہر بن جاتے ہیں ۔ آرمینیا والے بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے ۔ کہ روس سے اتحاد کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ اس کے بعد اہل آرمینیا کی کردوں کے ہاتھوں جو دُرگت بنی اس کے لئے کرد ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے" ۔

مشہور مؤرخ البرٹ سورل نے تیس سال پیشتر ہی یہ پیشگوئی کر دی تھی ۔ کہ آرمینیا کو ترکوں سے الگ کرنے کی پالیسی خود اہل آرمینیا کے حق میں بہت خطرناک ہوگی ۔

ترکی کے لئے یہ وقت بہت نازک تھا ۔ ادبار کے بادل سلطنت پر چھائے تھے ۔ اور یورپ دُنیا کے نقشہ پر سے اس کا نشان تک مٹانے پر تلا ہوا تھا اور رُوس بڑی عیاری اور سفاکی سے یورپ کے اس مردِ بیمار کا گلا دبوچے بیٹھا تھا ۔

سلطنت ترکی کو اہل آرمینیا کی پیہم دغابازیوں اور روس کی معاندانہ چالوں سے جب رُوس کے حملے کا یقین ہو گیا ۔ تو انہوں نے وہی کیا جو ایسے نازک موقع پر کوئی اور قوم کرتی یعنی انہوں نے میدانِ جنگ کے قرب و جوار سے ان سب لوگوں کو نکال دیا جن کی دغابازی سے انہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا ۔ گو ترکوں کے اس طرز عمل سے اکثر بے گناہ بھی مصائب کا شکار ہوئے لیکن ان بے گناہوں کا خون انہی اہلِ آرمینیا کے سر ہے جو زار کی حمایت کے سُہانے خواب دیکھ رہے تھے ۔

اور اس تمام کشت و خون اور بے گناہوں کے مصائب کا ذمہ دار صرف زار تھا جس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو کبھی آرام کا سانس نہ لینے دیا جائے۔ یہی حال خود روسیوں کا تھا جن کے لئے زار کی حکومت قہرِ الٰہی کے مترادف تھی۔ روسیوں کا زار کو معزول کرنا اہلِ مشرق کے نقطۂ نگاہ سے تین سو سال کے بعد روسیوں کا ایک عظیم الشان کارنامہ تھا اور دُنیا کے لئے ایک درسِ عبرت! علامہ اقبال نے شاید کسی ایسے ہی موقع کے متعلق فرمایا تھا ؎

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رُسوائیٔ تدبیر دیکھ
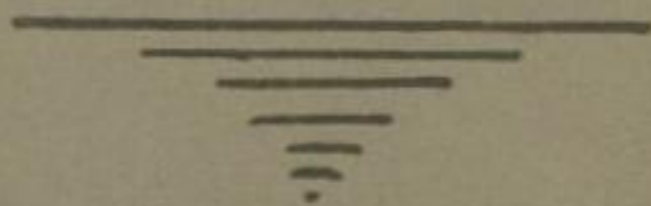
اسلامیانِ ہند

پر

ایک طائرانہ نظر

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

سے

انقلاب ۱۹۴۷ء

تک

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی

(اقبالؒ)

شہنشاہ ہندوستان عالمگیر اورنگ زیب کے انتقال کے بعد پورے ڈیڑھ سو برس تک مغل ہندوستان پر حکمران رہے اس لئے یہ کہنا کہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے سے زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے محض غلط ہے۔ ہاں! یہ درست ہے کہ عالمگیرؒ کے بعد مغل فرمانرواؤں کی وہ پہلی سی سطوت اور جبروت باقی نہ رہی اور ہندوستان میں دوسروں کو بھی سر اٹھانے کا موقع ملنے لگا۔ مغل سلطنت کو سب سے پہلے نادر شاہ قاچار کے حملہ نے کمزور کیا۔ اس کے بعد مرہٹوں کی یورشوں نے نقصان پہنچایا۔ پنجاب میں سکھوں کی لوٹ مار سے سلطنت کے وقار کو ضعف پہنچا۔ اور امرائے سلطنت کی رقابتوں نے نظام سلطنت کو کمزور کر دیا۔

پھر ایک وہ وقت آیا کہ مغل محض نام کے بادشاہ رہ گئے اور ملک کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی پالیسی صرف یہ تھی کہ ہر ممکن چالبازی سے مسلمانوں کو کمزور کیا جائے۔ ۸ر مارچ ۱۷۸۷ء کو "کمپنی بہادر" کی طرف سے کلکتہ میں ایک اعلان کیا گیا۔ جس

میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کی سلطنت تو اب صرف نام کی سلطنت رہ گئی ہے۔ رہے ہندو تو ہندو کی طرف سے "کمپنی بہادر" کو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ ہندو لڑنے والی قوم نہیں گو ہمیں یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ ملک میں جو ہندو ریاستیں ہیں ہم انہیں ختم کر دیں لیکن اگر اس مشورہ پر عمل کیا جائے تو خوف ہے کہ ہماری رقیب سلطنت (یعنی مغل) جو ہماری حقیقی دشمن ہے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر ہم سے نبرد آزما ہو جائے۔

اس اعلان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کا ابتدا ہی میں مسلمانوں کے متعلق کیا خیال تھا۔ اور اس سے بہت قبل بقول لارڈ میکالے لارڈ کلائیو کی بھی یہی پالیسی تھی کہ بنگال کے نظم و نسق میں کوئی محکمہ کسی مسلمان افسر کے سپرد نہ کیا جائے گو یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندو اور مسلمان میں پورا پورا اتفاق تھا اور دونوں قوموں میں کسی قسم کی کشمکش مطلقاً نہیں پائی جاتی تھی۔ تاہم انگریز برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جیسے بھی ہو۔ ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے اُس نے مختلف ہتھکنڈے اختیار کر رکھے تھے۔ یعنی اخباروں میں ایسے مضامین شائع کرنا جن سے ہندوؤں کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے جا سکیں اور مسلمان بادشاہوں کے مظالم کی فرضی اور من گھڑت داستانیں ہندوؤں میں پھیلائی جائیں۔ انگریز کے اس ناپاک پراپیگنڈے کا صرف ایک مقصد تھا۔ انگریز مسلمان سے ڈرتا تھا۔ اس لئے وہ یہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو ہندوؤں کو اُبھار کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے کھڑا کر دے تاکہ دونوں قوموں میں جُوتوں میں دال بٹنے لگے۔ اور وہ بلا خدشہ ہندوستان پر حکومت کرے۔ انگریز جب تک ہندوستان میں رہا اسی پالیسی پر چلتا رہا اور جاتے جاتے بھی یہی آگ لگا گیا۔

انگریزوں کی ان معاندانہ کارروائیوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ ہندوؤں نے جو ایک طویل مدت سے مسلمانوں کی غلامی کر رہے تھے (اگر اس غلامی میں بھی وہ جس طرح پھولے پھلے اوراق تاریخ اس کے شاہد ہیں) اپنی تنظیم شروع کر دی۔ انگریز شہ دینے کو موجود تھا۔ اور ہندو کو اس کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ہندو کی اس تنظیم جدید کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کلچر کو تباہ اور برباد کیا جائے اور ہندی زبان کی ترویج کی جائے ؞

اس وقت سب سے پہلے بنگال اور بہار میں مولوی شریعت اللہ صاحب نے ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ مزدوروں اور کاشتکاروں میں بیداری پیدا کی جائے۔ لیکن یہ مفید تحریک بہت جلد ختم ہو گئی اس کے کچھ عرصہ بعد اودھ سے مولوی سید احمدؒ صاحب بریلوی نے اسی قسم کی ایک تحریک نئے سرے سے شروع کی۔ اس تحریک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس تحریک سے مسلمانوں میں بھی ایک قسم کی سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی۔ انگریزوں نے اس تحریک کو "وہابی تحریک" کا لقب دیا۔ اس میں بھی انگریزوں کی ایک سیاسی چال تھی یعنی تحریک کو وہابی تحریک کہہ کر دوسرے مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی جائے یہ تحریک مسلمانوں کی تنظیم کے لئے اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں سکھوں نے پنجاب اور دیگر مقامات میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مولوی سید احمد صاحب بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ انگریزوں نے اس فتوے کو بھی اپنے حق میں نیک فال سمجھا۔ کیونکہ اس سے مسلمان

جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی معاندانہ چالوں کا جوڑ توڑ کر رہے تھے ادھر کا خیال چھوڑ کر سکھوں سے لڑنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انگریزوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسلمانوں کی پیٹھ ٹھونکی اور اُس وقت کے اودھ کے لفٹنٹ گورنر نے یہ اعلان کر دیا کہ جب تک انگریزی مقبوضات میں اس قسم کی سرگرمیوں سے گڑبڑ پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔ انگریز مسلمانوں کی جہاد کی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرینگے۔ چنانچہ سکھوں کے خلاف مسلمانوں نے ہتھیار اُٹھائے اور سکھ میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگنے پر مجبور ہونے لگے۔ مولوی سید احمد صاحب بریلوی مسلسل چھ سال تک اس کام میں لگے رہے اور اسی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔ انگریز بھی اس جنگ میں مسلمانوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتے رہے کیونکہ پنجاب میں سکھوں کا غلبہ ہو جانے سے انگریزی مقبوضات بھی خطرے سے محفوظ نہ تھے۔ کپتان ایبٹ نے جو سکھ دربار میں ریذیڈنٹ کا اسسٹنٹ تھا۔ صوبہ سرحد کے لوگوں کو خفیہ طور پر مالی مدد دی۔ اور انہیں سکھوں کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیا۔ اور آخر وہ تحریک جو مسلمانوں نے سکھوں کے خلاف شروع کی تھی انگریزوں نے باقاعدہ طور پر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۸۴۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں نے پنجاب پر حملہ کر دیا اور سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا اور مسلمان مجاہدین کو حکم دیا کہ وہ پنجاب اور سرحد سے واپس آجائیں۔ اور اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں۔ پندرہ برس کی جدوجہد کے بعد مسلمان مجاہد جب اپنے اپنے وطن واپس لوٹے تو ملک کا نظام بالکل بدلا ہوا پایا۔ اور ہر جگہ ہندو کا طوطی بولتا نظر آیا۔

مسلمانوں نے ابھی تک اپنے لئے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا تھا لیکن اتنا

اب وہ بھی سمجھ چکے تھے کہ انگریز کے مسلمانوں کے متعلق نیک ارادے نہیں۔ مولوی سید احمد صاحب شہید کی تحریک کو جیسے کہ بیان ہو چکا ہے انگریزوں نے بعد میں "وہابی تحریک" کا نام دیا اور اس تحریک میں شامل ہونے والوں پر آئے دن سختیاں ہونے لگیں ؎

جنوری ۱۸۵۷ء میں واقعات نے ایک اور رنگ اختیار کر لیا۔ اور وہ بھی بالکل اچانک ہی۔ کلکتہ میں ہندوستانی فوج میں کسی طرح یہ افواہ پھیل گئی کہ فوج کو جو نئے کارتوس ملے ہیں۔ ان پر سؤر اور گائے کی چربی کے خول لگے ہوئے ہیں۔ بندوق میں یہ کارتوس داخل کرنے سے پیشتر سپاہی کو یہ خول دانتوں سے اُتارنا ہوتا تھا۔ اس افواہ کا ہندو اور مسلمان سپاہیوں پر بہت بُرا اثر ہوا اور دونوں نے یہ سمجھا کہ انگریز اس طرح دونوں کا مذہب خراب کرنا چاہتا ہے۔ کلکتہ سے یہ خبر دوسری فوجی چھاونیوں میں بھی پہنچی اور سب جگہ بے چینی کے آثار پیدا ہوتے نظر آنے لگے۔ اور سپاہی کُھلے بندوں اس کے خلاف آواز اُٹھانے لگے۔ ادھر انگریزوں نے تالیفِ قلوب یا یہ غلط فہمی رفع کرنے کی بجائے آواز اُٹھانے والوں پر سختی کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ ۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے سپاہیوں نے اپنے افسروں کی متشددانہ پالیسی سے تنگ آ کر کُھلم کُھلا بغاوت کر دی اور عوام الناس بھی اس میں شامل ہو گئے۔ عوام الناس کے شامل ہونے سے اس بدامنی یا بے چینی نے ایک انقلاب کی صورت اختیار کر لی اور یہ آگ مُلک کے ایک بہت بڑے حصّے میں پھیل گئی ؎

۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جو انقلاب آیا اُس نے اس ملک میں مسلمانوں کی کلچر پر ایک خوفناک ضرب لگائی۔ سیاست کا آئین یہی ہے کہ فاتح مفتوح کو ہمیشہ ذلیل وخوار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان پر مغل حکمران تھے۔ انگریز سوداگروں کے بھیس میں آئے۔ اور اپنی ریشہ دوانیوں اور سیاسی چالوں سے ملک پر چھا گئے۔ اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ مغل بادشاہ ہو کا نام رہ گیا۔ اور سلطنت پر انگریز قابض ہو گئے۔ لیکن انگریزوں کی نگاہ میں یہ نام بھی کھٹکتا تھا مغلوں کا آخری تاجدار گو انگریزوں کا ایک وظیفہ خوار تھا لیکن بادشاہی کا دُم چھلا جو اس کے ساتھ لگا تھا اس سے اکثر لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں۔ اہلِ نظر دیکھ رہے تھے کہ مغلوں کی سلطنت چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہی ہے اور یہ چراغ اب بجھا چاہتا ہے۔ اچانک واقعات نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی، کہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کا شعلہ بھڑک اُٹھا اور ملک میں ایک سیاسی انقلاب کی صورت پیدا ہو گئی اور انگریز نے اس سیاسی انقلاب کو تنگ نظری سے "غدر" کا نام دیا۔ نتیجہ وہی ہوا۔ جو ایک کمزور سلطنت کی اس قسم کی چالوں سے ہوا کرتا ہے۔ مغلوں کا آخری تاجدار بادشاہ سے قیدی بنا۔ مغل شہزادے بغیر مقدمہ یا سماعت کے گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ مغل سلطنت کا چراغ بجھ گیا۔ اور ملک پر آئینی طور پر انگریز کا قبضہ ہو گیا چونکہ اس انقلاب یا غدر کے ذمہ دار انگریزوں کے نزدیک صرف مسلمان تھے اس لئے مسلمانوں پر خوفناک تباہی آئی اور انگریز نے اسلامی کلچر کو ملیا میٹ کرنے کی پالیسی پر شدّومد سے عمل کرنا شروع کر دیا اور ہندو نے اس سے پورا پورا تعاون کیا۔

انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں پر جو تباہی آئی اور جس طرح انگریز نے ہر مرحلہ پر مسلمان کے حقوق کو نظر انداز کیا یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس پر صرف ایک مؤرخ روشنی ڈال سکتا ہے۔ ان اوراق میں اس شرمناک داستان کے لئے گنجائش نہیں۔ لیکن بہ سبیل تذکرہ کچھ ضروری باتیں بیان کرنا ضروری ہے۔ انگریزوں نے جب ہندوستان کی حکومت سنبھالی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کلکتہ انگریزی تہذیب اور تمدن کا مرکز بن گیا اور انگریز کی سرکار میں مسلمان کا دیرینہ اور قومی دشمن ہندو ہر میدان میں پیش پیش نظر آنے لگا۔ ہندو کچھ کم ایک ہزار برس مسلمان کی "غلامی" میں زندگی بسر کر چکا تھا۔ گو مغل شہنشاہوں نے اگرچہ مسلمان کو اپنی داہنی آنکھ سمجھا۔ تو ہندو کو بائیں لیکن قدرت بھی ہندو کی مُسلم کُش ذہنیت کو بدلنے سے ہمیشہ قاصر ہی رہی۔ غدر سے تو مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل گئی لیکن یہی غدر ہندو کے لئے بمصداق اس مثل کے کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ہندو کے لئے ترقی کے راستے خود بخود کھل گئے۔ اور مسلمانوں کے علماء دین نے بھی اس کام میں ہندوؤں کی یہ کہہ کر یا فتویٰ صادر کر کے کہ مسلمان کے لئے انگریزی پڑھنا حرام ہے بہت مدد کی۔ کلکتہ صرف انگریزی تہذیب اور تمدن کا ہی مرکز نہیں تھا بلکہ یہاں علمی اور سیاسی مجالس بھی قائم ہو چکی تھیں اور ان مجالس میں بھی ہندو ہی ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے۔ اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کا غالباً ماتم کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ۱۸۶۳ء میں نواب عبد اللطیف صاحب نے کلکتہ میں "مسلم لٹریری سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی گو اس سوسائٹی کے اراکین زیادہ تر مسلمان امرا ہی تھے لیکن عوام بھی اس کے جلسوں میں شوق سے شریک ہونے لگے۔ اس سوسائٹی کا سب

سے بڑا کام یہ تھا کہ مغربی تعلیم اور تہذیب کی روشنی میں اسلامی کلچر کو از سرِ نو زندہ کیا جائے اور مسلمانوں کے یہ ذہن نشین کیا جائے کہ اگر وہ اپنی اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدّن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ حکمران سے اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مغربی اقوام کی تعلیم اور تمدّن سے ضرور واقف ہونا چاہئے اور انگریزی زبان سیکھنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہئے چنانچہ کلکتہ میں جو درس گاہ "ہیسٹنگز کلکتہ مدرسہ" کے نام سے تھی سب سے پہلے اِس میں مسلمان بچوں کے لئے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور بتدریج بنگال کے دوسرے اضلاع میں بھی مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لئے مدارس قائم کئے گئے اور ہر جگہ مسلمان امرا نے ان مدارس کے اخراجات کا بار اُٹھایا۔ مغلوں کی سلطنت ختم ہونے کے بعد اس طرح مسلمانوں نے ترقی کے زینہ پر پہلا قدم رکھا ؏

چونکہ قدرت کو بھی غالباً مسلمانوں کو سنبھلنے کا کچھ موقع دینا تھا۔ سنہ ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک بڑے معتدر گھرانے میں ایک بچّہ پیدا ہؤا جس کا نام والدین نے سیّد احمد رکھا۔ یہ وہی سیّد احمدؒ ہے جو بعد میں دُنیا میں سر سید کے نام سے مشہور ہؤا اور مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کے لئے ایک تجربہ کار کھوّیا ثابت ہؤا۔ غدر کے بعد جب انگریزی راج کا نزلہ صرف مسلمانوں ہی پر گرنے لگا تو سید احمد خاں نے مسلمانوں کی مدد کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور ایک سچّے فرزند اسلام کی طرح اس کام کے لئے کمر ہمّت باندھی اور زبان اور قلم سے قوم و ملّت کی خدمت شروع کر دی۔ ایک طرف اُس نے مسلمانوں کو غیرت دلانی شروع کی۔ دُوسری طرف

اُس نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے انگریز کو بھی للکارا۔ انگریز کو مسلمان سے صرف اس لئے عداوت تھی کہ "غدر" یا انقلاب کا ذمہ دار وہ صرف مسلمان کو سمجھتا تھا۔ اس لئے حکومت کی پالیسی صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کو ہمیشہ نظر انداز کیا جائے اور حکومت کے کسی شعبہ میں انہیں اُبھرنے کا موقع نہ دیا جائے ایک حکومت کی مُسلم آزار پالیسی دوسرے خود مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا فقدان اور حکمران سے شکایت اور رنجش سر سیدؒ کے لئے یہ باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ لیکن اس مرد مجاہد نے ہمّت نہیں ہاری۔ اور زندگی مسلمانوں کے فلاح اور بہبود کے لئے وقف کر دی ایک طرف اس نے فاتح کو مفتوح سے رواداری برتنے کی ترغیب دی دوسری طرف اپنی قوم کو سمجھایا کہ حکمران سے ناراض رہنا قوم وملّت کے لئے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ ۱۸۶۹ء میں جب سر سید انگلستان گئے تو جانے سے پیشتر وہ اپنے مشن میں ایک حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ اس کام میں اُنہیں جس چیز سے سب سے زیادہ مدد ملی۔ وہ ان کی مشہور کتاب "اسباب بغاوت" تھی گو یہ کتاب حکمران کے غصّہ کے لئے شروع شروع میں ایک تازیانہ ثابت ہوئی لیکن حقیقت اور سچے واقعات سے انگریز کو بھی انکار کی جرات نہ ہو سکی۔ "اسباب بغاوت" سر سیّد نے ۱۸۵۹ء میں اردو میں شائع کی تھی اس میں اُنہوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ مسلمانوں سے غلطی ضرور سرزد ہوئی لیکن اس کے ساتھ اُنہوں نے حکمران کی مسلم آزار پالیسی پر بھی کڑی نکتہ چینی کی اور دلائل و براہان سے یہ ثابت کر دیا۔ کہ اگر انگریز بھی "حکمت عملی" سے کام لیتے تو مسلمانوں کا دل موہ لینا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ ۱۸۶۰ء میں سر سید نے ایک اور کتاب "ہندوستان

کے وفادار مسلمان" کے نام سے شائع کی۔ اس کتاب میں اُنہوں نے ان مسلمانوں کے نام اور خدمات گنوائیں جنہوں نے غدر کے موقع پر انگریزوں کی امداد کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سر سید نے مختلف اضلاع میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے بھی قائم کئے اور ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کا کام یہ تھا کہ انگریزی زبان کی مفید مطلب کتب کا اُردو زبان میں ترجمہ شائع کرے۔

دوسری طرف سر سیّد نے مذہبی نقطہ نگاہ سے مسلمان اور انگریز کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش کی اور اس موضوع پر بھی بہت سے پمفلٹ شائع کئے۔

سر سید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) ہے۔ یہ کالج قائم کرنے کا سب سے بڑا مقصد جو سر سید کے مدنظر تھا یہ تھا کہ مغربی اور اسلامی کلچر کو ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑا کر دیا جائے (لیکن افسوس ہے کہ ہندو حکومت اس کالج کی بیخ کنی کے درپے ہو رہی ہے)۔ سر سید کا دوسرا بڑا کارنامہ "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" ہے۔ اس کانفرنس کے وجود سے مسلمانوں میں مذہبی تعلیمی اور سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔ اور مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر اُنہیں اپنی اسلامی کلچر۔ تہذیب اور تمدن کو زندہ رکھنا ہے تو اُنہیں حکمران سے پورا پورا تعاون کرنا ہو گا۔ مسلمانوں کی حیات سیاسی کے طالب علم کو یہ کسی وقت بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں جیسے جیسے سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی ہندو من حیث القوم

ان کی مخالفت پر تیار ہوتے گئے۔

ہندوؤں کی مذہبی اور سوشل تحریکوں کو کامیابی سے چلانے کے لئے ملک میں کئی ایک انجمنیں موجود تھیں لیکن جب ہندو اور مسلمان کے سیاسی حقوق کا مسئلہ زیر بحث آیا تو ہندوؤں نے "برٹش ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنگال میں قائم کی۔ پھر بمبئی میں "بمبئی ایسوسی ایشن" کے نام سے دادا بھائی نارو جی اور ان کے چند ہم خیال حضرات نے ایک سیاسی انجمن قائم کی۔ پھر مہاراشٹر میں "سروجانک سبھا" کے نام سے مہاراشٹر کے شہر پونا میں ایک سیاسی پارٹی وجود میں آئی۔ اور مدراس میں ہندوؤں نے "مہاجن سبھا" کے نام سے ایک سیاسی انجمن بنائی۔ ۱۸۷۶ء میں بنگالیوں نے بنگال میں "انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک نئی انجمن کی تشکیل کی۔ اس کے بانی سر سریندر ناتھ بنرجی تھے۔ "انڈین ایسوسی ایشن" کے وجود سے ہندوؤں کی سیاسی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ لوگ کھلے بندوں حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے لگے۔

پھر حکومت کے ایما سے مسٹر اے۔ او۔ ہیوم جو انڈین سول سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنے عہدے کی میعاد پوری کرنے کے بعد پنشن لے کر ہندوستان میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ان سیاسی جماعتوں سے صلاح مشورہ کر کے انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے الگ ہو کر ایک مرکزی جماعت میں شامل ہو جائیں اور انگلستان کی

پارلیمنٹ کے طریق پر حکومت کے خلاف ایک "اپوزیشن پارٹی" قائم کر کے منظم طریق پر اپنے حقوق کی حفاظت کا کام کریں۔ اس وقت ہندوستان میں لارڈ ڈفرن وائسرائے تھے۔ چنانچہ مختلف ہندو لیڈروں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مسٹر ہیوم نے اپنی سکیم لارڈ ڈفرن کے سامنے پیش کی اور وائسرائے نے اس سکیم کو پسند کیا چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۵ء کو "آل انڈیا یونین" کے نام سے بمبئی میں ایک مرکزی سیاسی جماعت وجود میں آئی اور بعد میں یہی "آل انڈیا یونین" "آل انڈیا کانگریس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سیاسی جماعت کا نام محض اس لئے تبدیل کیا گیا کہ ہندو کے سامنے صرف حکومت کی اپوزیشن یعنی مخالفت کا ہی سوال نہیں تھا بلکہ وہ اسے برہمو سماج اور آریہ سماج کے اصولوں پر چلانا چاہتے تھے۔ یعنی وہ ایک خالص مرکزی "قومی ادارہ" بنانا چاہتے تھے۔ نام تبدیل کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "آل انڈیا کانگریس" کے بانیوں کا مسلمانوں کے متعلق کیا نقطہ نظر تھا۔ اس مرکزی جماعت کے وجود سے ملک میں ایک خالص ہندو سیاسی جماعت قائم ہو گئی اور بتدریج فرقہ دارانہ رنگ اختیار کرتی گئی۔ اس وقت اس کے کرتا دھرتا جو کچھ تھے صرف ہندو تھے۔ خاص کر بنگالی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے اراکین میں ہمیں عباس طیب جی کا نام بھی نظر آتا ہے یا گنتی کے چند ایک مسلمان اور بھی۔ لیکن سرسید کانگریس کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنے کی کوشش شروع کر دی ✣

سرسید نے کانگریس کی مخالفت کیوں کی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کی کلچر مٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور دونوں قوموں میں اختلافات کی خلیج روز بروز وسیع ہو رہی تھی۔ پھر ہندوؤں نے زبان کا سوال اٹھایا۔ اُردو مدت سے ہندو اور مسلمان کی مشترکہ زبان تھی اور دونوں قوموں کے ادبا اور شعرا نے اسے پروان چڑھایا تھا لیکن ہندو اب اسی زبان کی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگے تھے اور وہ زبان جو ہندو اور مسلمان کے اتحاد کی یادگار تھی۔ اس یادگار کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ اور حکومت سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہندی کو قومی زبان کا رتبہ دیا جائے۔ پھر ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ تھا۔ اور اس مسئلہ نے اچانک ایسی خوفناک صورت اختیار کر لی کہ مہاراشٹر اور اودھ میں کئی ایک مقامات پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ حالانکہ ذبیحہ گاؤ کوئی نئی رسم نہیں تھی۔ لیکن ہندو لیڈروں نے اس مسئلہ کو پوری طرح ہوا دی۔ اور ہندو عوام کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ سر سیّد احمد خاں یہ چاہتے تھے کہ ہندو لیڈر اس فتنہ کو روکیں؛

کانگریس کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان معاشی اور تعلیمی معاملات میں ان سے بہت پیچھے تھے اور سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہونے سے پیشتر اس قابل ہو جائیں کہ وہ اپنے معاشی اور تعلیمی مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس لئے ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جب تک یہ کمی پوری نہ ہو جائے مسلمانوں کو سیاست سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کانگریس کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت اسے ایک مخالف سیاسی جماعت سمجھنے لگی تھی مسلمان غریب کی وفاداری

چونکہ پہلے ہی انگریز کی نگاہ میں مشتبہ تھی اس لئے سرسیدؒ کو یہ اندیشہ بھی تھا۔ کہ کہیں پھر مسلمان پر ہی انگریز کا نزلہ نہ گرے اور اسے کوئی اور روزِ بد نہ دیکھنا پڑے۔ سرسیدؒ کے دلائل اس قدر قوی تھے کہ مسلمان اس سے انکار نہ کر سکے اور کانگریس سے انہوں نے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا۔ مسلمان صرف کانگریس سے علیحدہ ہوئے تھے لیکن نجی طور پر ان کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں اور وہ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ حکومت برطانیہ کو بدگمان کئے بغیر ملک میں مسلمان اپنی ایک طاقت اور انفرادیت قائم کریں لیکن اس ابتدائی زمانہ میں بھی کچھ مسلمانوں کو سرسیدؒ کی پالیسی سے اختلاف تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کا اقتدار ختم کریں اور اس کے بعد اپنے لئے ایک علیحدہ سیاسی مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اس تحریک کے ذمہ دار ہمارے بعض مولوی صاحبان تھے اور انہی کی کوششوں سے سرسیدؒ ایسے محب قوم اور محب وطن پر کفر اور دہریہ ہونے کا فتویٰ لگایا گیا۔ یعنی مسلمانوں پر جب تباہی آئی ان مولویوں کی تنگ نظری سے ہی آئی۔

وقت گزر رہا تھا اور مسلمان دیکھ رہے تھے کہ انگریز اور ہندو دونوں اس کے جائز حقوق سے بھی اسے محروم رکھے چلے آتے ہیں۔ ۱۸۶۱ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو کچھ اصلاحات عطا کیں اور ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے لئے آئین تیار کرنے کا موقع دیا گیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں آئین ساز جماعتیں بنائی گئیں لیکن ان مجلسوں کے اراکین مقرر کرنے کا اختیار حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ۱۸۹۲ء میں مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا

گیا۔ اور ان اراکین کے اختیارات میں بھی کچھ توسیع کی گئی لیکن ان اصلاحات سے مسلمانوں کو کوئی بنیادی فائدہ مطلقاً حاصل نہ ہو سکا۔ ایک مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان۔ دوسرے حکومت بھی کچھ بے پروا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سرکاری محکمہ میں ہندو چھائے ہوئے نظر آنے لگے اور تعصّب نے یہاں تک زور پکڑا کہ بڑے بڑے عہدوں کا تو ذکر ہی کیا معمولی ملازمتیں بھی مسلمانوں کو مشکل سے ہی ملتیں۔ سب سے بڑی مصیبت "مخلوط انتخاب" تھا۔ مسلمان چونکہ ہر نقطہ نظر سے اقلیت میں تھے اس لئے وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ؎

اس قسم کے پے در پے واقعات سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندو کی ذہنیت کبھی بدل نہیں سکتی اور ہندو کا دامن تعصّب سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ ہندو کو تو صرف ایک دھن سمائی تھی کہ نو سو سال کی غلامی کا دھبّہ کسی طرح دھویا جائے۔ اور ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت پر جو اسلامی اثرات پائے جاتے ہیں انہیں ہر قیمت پر ملیامیٹ کیا جائے لیکن ہندو یہ بالکل ہی بھول گئے کہ مسلمانوں کو اگر ان کی تہذیب اور کلچر سے کچھ کد ہوتی تو ہندوستان پر نو سو سال حکومت کرنے کا اتنا نتیجہ تو ضرور ہوتا کہ مسلمان کے ہاتھوں ہندوستان کی پراچین تہذیب کے نقش و نگار تک بھی اس وقت تک مٹ چکے ہوتے اور ہندو کلچر محض ایک افسانہ ہو کر رہ گئی ہوتی ؎

تو خیر! مسلمانوں کو بھی اب اپنے مستقبل کا فکر ہونے لگا تھا چنانچہ علی گڈھ

میں ۱۸۹۳ء میں "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک سیاسی جماعت وجود میں آئی۔ اور جسٹس محمود نے "مخلوط انتخاب" پر کڑی نکتہ چینی کی اور حکومت کو توجہ دلائی کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم متصور کرتے ہوئے جداگانہ طریقہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا جائے لیکن افسوس کہ یہ سیاسی جماعت نہ تو کوئی مفید کام ہی کر سکی اور نہ زیادہ روز زندہ رہ سکی لیکن مسلمانوں میں جو سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ اُسے اس سے فائدہ ضرور ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں ہندوؤں کے مشہور لیڈر بال گنگا دھر تلک نے پونا میں "ذبیحہ گاؤ" کے خلاف ایک فرقہ دار جماعت قائم کی۔ اور اس جماعت نے اپنی گندی ذہنیت کے تمام حربوں کو بروئے کار لا کر مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلانا شروع کر دیا۔ اس سے مسلم پریس نے بھی کروٹ بدلی۔ اور مسلمان اور مسلمانوں کی کلچر کی حفاظت کی بحث شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا۔ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا تھا اس لئے اس اعلان سے ہندوؤں میں ایک اضطراب اور خوف سا پیدا ہو گیا۔ کانگریس نے اس مسئلہ کو آل انڈیا مسئلہ کا رنگ دے دیا کیونکہ تقسیم بنگال سے ہندو قومیت پر ایک کاری ضرب لگنے کا اندیشہ تھا ہندوؤں نے ہر ممکن طریق سے تقسیم بنگال کی مخالفت کی۔ ایک طرف برطانوی مال کے "بائیکاٹ" کی تحریک شروع کر دی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بنگال۔ بہار اور اودھ میں ہندو مسلم فسادات رُونما ہوئے اور دونوں قوموں کے تعلقات میں ایک زبردست کشیدگی پیدا ہو گئی۔

لارڈ کرزن گو سخت مزاج تو تھے لیکن بڑے معاملہ فہم بھی تھے وہ ہندوؤں کی

غوغا آرائی اور شورش سے بالکل متاثر نہیں ہوئے لیکن انہیں بہت جلد اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس وقت ہندوستان میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف تھے اور لارڈ کچنر اور لارڈ کرزن میں ملک کے نظم ونسق کے متعلق کچھ اختلافات تھے۔ معاملہ پارلیمنٹ تک پہنچا۔ پارلیمنٹ نے لارڈ کچنر کے نظریہ کی حمایت کی لارڈ کرزن استعفیٰ دے کر واپس چلے گئے اور ان کی جگہ لارڈ منٹو وائسرائے ہوئے۔ لارڈ منٹو کے آنے سے جب ہندوستان کو کچھ نئی اصلاحات ملنے کی بھی اُمید ہونے لگی تو ہندوؤں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں ختم کر دیں اور اپنے لئے انگریزوں سے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسی طرح مسلمان لیڈروں نے بھی جن میں نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور ہز ہائینس سر آغا خاں سب سے ممتاز نظر آتے تھے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے ایک وفد وائسرائے سے ملے چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے وفد نے اپنی تجاویز کا مسودہ لارڈ منٹو کو دے دیا۔ ان تجاویز میں سب سے اہم تجویز یا مطالبہ یہ تھا کہ مخلوط انتخاب ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نشستیں دی جائیں اور بڑے بڑے عہدے بھی اسی لحاظ سے مسلمانوں کو ملیں اور ہندوؤں نے اپنی ذہنیت کے مطابق ان تجاویز کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی کیونکہ وہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ انفرادیت دیکھنے کے کسی صورت میں بھی روادار نہ تھے ادھر مسلمانوں کی بدقسمتی سے کچھ مسلمان ہندوؤں کے شور و غوغا سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ جداگانہ انتخاب کی بجائے مخصوص نشستیں لینے پر آمادہ نظر آنے لگے اور اسی

وقت سے سیاسی نقطہ نظر سے مسلمان دو جماعتوں میں بٹ گئے ÷

مسلمان اپنی تجاویز یا مطالبات تو پیش کر چکے تھے لیکن اب سوال یہ تھا۔ کہ اگر ان تجاویز یا مطالبات کے متعلق سرکاری حکام سے تبادلہ خیالات کرنا پڑا۔ تو اس کا انتظام کیا ہوگا۔ نواب محسن الملک نے اس مشکل کا حل یہ پیش کیا کہ لارڈ منٹو کے پاس مسلمانوں کا جو وفد گیا تھا۔ اس کے اراکین کو ایک انجمن یا جماعت کی صورت دی جائے اور یہی انجمن یا جماعت حکام سے گفت و شنید کرے۔ نواب محسن الملک کی اس تجویز کو ملک کے طول و بلد میں مسلمانوں نے بہت پسند کیا۔ اور نواب سلیم اللہ خاں بہادر نواب ڈھاکہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ڈھاکہ میں اس انجمن کی ترتیب اور تشکیل کا کام شروع کیا جائے چنانچہ نواب صاحب کی دعوت پر ڈھاکہ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ملک کے ہر گوشہ سے مسلمانوں کے نمائندے جمع ہوئے اور غور و خوض کے بعد نواب وقار الملک بہادر کی زیر صدارت "مسلم لیگ" کے نام سے مسلمانوں کی ایک مرکزی سیاسی انجمن وجود میں آئی۔ "مسلم لیگ" کا نصب العین یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی ترقی اور حفاظت کے وسائل اختیار کئے جائیں۔ نواب وقار الملک مسلم لیگ کے سیکرٹری اور نواب محسن الملک جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ادھر ہندوؤں نے انہی ایام میں لاہور میں "ہندو مہاسبھا" کے نام سے ایک خالص ہندو جماعت قائم کر لی۔ کانگریس کے ہوتے سانتے "ہندو مہاسبھا" قائم کرنے کا صرف ایک مقصد تھا یعنی مسلمانوں کی مخالفت کے لئے ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جس کا بظاہر "آل انڈیا نیشنل کانگریس" سے کوئی واسطہ نہ ہو یعنی مسلمانوں کے خلاف

وہ کام جو کانگریس کھلے بندوں کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ وہ "ہندو مہاسبھا" سے کرایا جائے مسلمان جیسے کہ بیان کیا جاچکا ہے لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس اپنے مطالبات اور تجاویز بھیج چکے تھے۔ لارڈ منٹو نے پارلیمنٹ میں اصلاحات کا جو مسودہ بھیجا اس میں جداگانہ انتخاب کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت لارڈ مارلے وزیر ہند تھے چنانچہ مسلمانوں کو جب اس کا علم ہؤا تو لندن میں جسٹس امیر علی کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک وفد وزیر ہند سے ملا اور مسلمانوں کا نقطہ نظر بڑی خوبی اور وضاحت سے پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ہندوستان میں "منٹو مارلے" سکیم کے نام سے جو تصریحات ہوئیں ان میں مسلمانوں کا "جداگانہ انتخاب" کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اور یہی مسلم لیگ کا سب سے پہلا کارنامہ متصور ہوتا ہے لیکن ہندو کب خاموش بیٹھنے والا تھا۔ مسلم لیگ کا وجود ہندو کی انفرادیت کیلئے خطرے کا ایک مستقل اعلان تھا اس نے طرح طرح سے مسلم لیگ کے خلاف مسلمانوں میں پراپیگنڈا شروع کر دیا اور اسے "سرکار پرست جماعت" کے نام سے بدنام کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ پر کچھ مسلمان بھی مسلم لیگ سے بدگمانی کا اظہار کرنے لگے اور یہ بالکل ہی بھول گئے کہ "انڈین نیشنل کانگریس" کا خالق ایک انگریز مسٹر اے ہیوم تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کا وجود انگریزوں کے ایما سے ظہور میں آیا تھا۔ اس لئے ہندو سے زیادہ سرکار پرست اور کون ہو سکتا تھا "انڈین نیشنل کانگریس" صرف ہندو قوم کے مفاد کے لئے تھی گو اس میں کچھ ناعاقبت اندیش مسلمان بھی شامل تھے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالص ہندو جماعت تھی اور صرف ہندو قوم کا مفاد اس کے مدنظر تھا چنانچہ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگریس نے جو قدم بھی اٹھایا ہندو اقتدار کو بڑھانے کیلئے

اُٹھایا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس کے بعد کانگریس کے رویّے میں کچھ تبدیلی بھی ہوتی رہی لیکن نصب العین میں کبھی فرق نہ آیا۔

مسلم لیگ کے قیام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کشمکش دن بدن بڑھتی گئی۔ گو دونوں قوموں کے کچھ صاحب اثر آدمیوں نے صلح اور آشتی پیدا کرنے کی بھی بہت کوشش کی لیکن ہندو کی تنگ نظری سے یہ کوششیں ہمیشہ بے کار رہی رہیں۔ ادھر ہندوؤں نے بنگال اور مہاراشٹر میں حکومت برطانیہ کے خلاف ایک منظم ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ اس ایجی ٹیشن کی سب سے بڑی وجہ وہی تقسیم بنگال تھی حکومت نے اس ایجی ٹیشن کا قوت سے مقابلہ کیا اور لیڈروں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا چنانچہ مسلمانوں کے قومی دشمن اور ہندوؤں کے محبوب لیڈر بال گنگادھر تلک کو بھی چھ سال قید کی سزا ملی۔ ساتھ ہی حکومت نے اس سیاسی گڑبڑ کو رفع کرنے کو "منٹو مارلے" اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ انتہا پسند ہندو "منٹو مارلے" اصلاحات قبول کرنے کے خلاف تھے لیکن ان کے اعتدال پسند گروہ نے جس میں مسٹر گوکھلے اور اور سر سریندر ناتھ بینرجی ایسے معاملہ فہم آدمی تھے قوم کو ان اصلاحات سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ کر لیا۔ مسلمانوں کا چونکہ جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا۔ اس لئے مسلمان بھی مطمئن تھے اور ہندوؤں کے اعتدال پسند گروہ کے ساتھ مل کر کام کرنے پر تیار ہو گئے۔

مسلم لیگ کی سرگرمیاں بھی برابر جاری تھیں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک

کراچی۔امرتسر۔دہلی اور ناگپور میں اس کے اجلاس ہوئے لیکن اب مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا جو ملکی معاملات میں ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حامی تھا چنانچہ پھر ایکبار ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ہونے لگیں اور کچھ روز بعد الہ آباد میں سر ولیم ویڈربرن کی تحریک اور سر آغا خاں اور سید امیر علی کی تائید سے ایک اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی لیکن یہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی ؛

لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال محض اس خیال سے کی تھی کہ مسلمانوں کو بھی کچھ فائدہ پہنچے اور بنگال کے مسلمان بھی کچھ ترقی کرسکیں۔ہندوؤں نے جس روز تقسیم بنگال کا اعلان ہوا اسی دن سے حکومت کے خلاف شورش پیدا کردی اور اس شورش نے اتنا طول کھینچا کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لئے دہلی میں ۱۹۱۱ء میں ایک دربار منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں بادشاہ انگلستان اور ان کی ملکہ بھی شامل ہوئیں اور بادشاہ سلامت نے اپنی زبان سے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا۔اس اعلان سے مسلمانوں کے قدامت پسند لیڈروں کو بہت مایوسی ہوئی اور وہ خود ہی مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے ؛

۱۹۱۲ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس نواب صاحب ڈھاکہ کی صدارت میں ہوا اور مسلمانوں نے بڑے آزادانہ طور پر ملکی معاملات پر بحث کی اسی سال یورپ میں جنگ بلقان چھڑ گئی اور مسلمانوں میں سلطنت عثمانیہ کی بقا کے لئے بہت بے چینی اور اضطراب نظر آنے لگا۔مولانا شوکت علی نے "انجمن خدام کعبہ" کے نام سے ایک مجلس قائم کی اور مجلس کے اراکین ملک کے مختلف حصوں میں دورہ کرکے مسلمانوں کی رگِ حمیت کو ابھارنے لگے۔مولانا محمد علی کی تقریروں سے مسلمانوں میں ایک عالمگیر بیداری پیدا ہونے لگی آخر بلقان کی جنگ ختم ہوئی گو ترکوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تاہم یورپ

سے سلطنت عثمانیہ کے مٹ جانے کا جو خطرہ تھا اس سے مسلمانوں کو نجات مل گئی ؛

مسلمان اپنی حیاتِ سیاسی کی جدوجہد میں پہلے سے زیادہ مستعد نظر آتے تھے۔ حکومت برطانیہ اور ہندو بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ دس کروڑ مسلمانوں کی بات اب آسانی سے ٹالی نہیں جاسکتی لیکن قدرت کی بھی یہ ایک ستم ظریفی ہی تھی کہ نت نئے روز کوئی ایسی بات پیدا ہو جاتی جس سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی۔ اور وہ بھڑک اُٹھتے۔ ۱۹۱۳ء میں ہی دو ایک ایسے واقعات رُونما ہوئے جن سے مسلمانوں میں بہت اشتعال پیدا ہو گیا۔ ایک واقعہ کانپور میں مسلمانوں کی ایک مسجد کا کچھ حصہ شہید کر دینے کا تھا۔ حکومت غالباً کسی راستہ کو کشادہ کرنے کے لئے مسجد کا ایک حصّہ گروانا چاہتی تھی مسلمان مسجد کی بیحرمتی کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ معاملہ نے طول کھینچا اور مسجد کے پاس ہی فوج کی گولیوں سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اس سے تمام اسلامی ہندوستان میں حکومت کے خلاف اجی ٹیشن پیدا ہو گئی لیکن ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے جو ایک بہت شریف طبیعت اور بڑے نکتہ رس انسان تھے۔ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسلمانوں کو رام کرنے کیلئے مسجد کا قضیہ ان کی مرضی کے مطابق طے کر دیا۔ دوسرا ناگوار واقعہ اجودھیا میں ہندو مسلم فساد تھا۔ یہ فساد گائے کی قربانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس فساد کی وجہ سے ہندو مسلم تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے ؛

اپریل ۱۹۱۴ء میں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر سر جیمس مسٹن نے الہ آباد میں ہندوؤں اور

مسلمانوں کے اتحاد کیلئے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا اور دونوں قوموں کے اختلافات سلجھانے کیلئے سر علی محمد خاں مہاراجہ آف محمود آباد کی صدارت میں ایک کمیٹی بنادی۔ اس اتحاد کانفرنس کے انعقاد کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کو کچھ اور اصلاحات دینے کے سوال پر غور کر رہی تھی۔ اس لئے دونوں قوموں کا اتحاد اس مرحلہ پر ضروری تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس میں مسٹر جناح کا طوطی بولتا تھا اور ہندو قوم مسٹر جناح کی سیاست اور قابلیت کا لوہا مانتی تھی۔ مسٹر جناح ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے ممبر تو بن گئے۔ لیکن حقیقت میں وہ کانگریس کے ایک بہت سرگرم رکن تھے چنانچہ مئی ۱۹۱۴ء میں کانگریس نے مسٹر محمد علی جناح کو کانگریس کے ایک مقتدر وفد کا صدر بنا کر اس لئے انگلستان بھیجا کہ آپ اصلاحات کے متعلق کانگریس کا نقطہ نظر برٹش پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں۔ کانگریس کا یہ تاریخی وفد ابھی انگلستان میں ہی تھا کہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی اور اصلاحات کی سکیم ملتوی کر دی گئی۔ یورپ میں جنگ شروع ہوتے ہی مہاتما گاندھی آنجہانی نے کانگریس کی طرف سے اپنی قوم کے نام ایک اعلان جاری کیا اور اپنی قوم سے بڑے زوردار الفاظ میں یہ اپیل کی کہ تمام ہندوستانی اس جنگ میں حکومت برطانیہ کی مدد کریں۔

لیکن مسلم لیگ نے ابھی تک اس قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کیونکہ اس کی نگاہ تو ترکی اور مصر پر تھی اور وہ کسی قسم کا اعلان کرنے سے پیشتر یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے متعلق جنگ کے دوران میں کیا پالیسی اختیار کرے گی لیکن ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ اور ترک جرمنی کے ساتھ شامل ہو گئے اس سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان بہت متاثر ہوئے اور علمائے دین نے بھی جو انگریزوں کی مسلم آزار روش سے حکومت سے ناراض تھے عوام الناس کا ساتھ

دیا اور مسلمانوں میں حکومت انگلستان کے خلاف آواز بلند ہونے لگی۔ یورپ میں جنگ شروع ہوتے ہی حکومت نے ہندوستان میں "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" نافذ کر دیا۔ اور اسی ایکٹ کے ماتحت مسلمانوں کے برگزیدہ لیڈروں مولانا شوکت علی۔ مولانا محمد علی۔ اور مولانا حسرت موہانی کو نظر بند کر دیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جو مکہ میں اس وقت مقیم تھے۔ شریف مکہ نے انگریزوں کے ایما سے ان کی حرکات و سکنات کی نگرانی شروع کر دی اور آخر انگریزوں نے حضرت شیخ الہند کو مالٹا میں نظر بند کر دیا۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسٹر مظہر الحق کی زیر صدارت مسلم لیگ کا ایک اجلاس ہوا۔ اور اسی سال اور انہی ایام میں کانگریس نے بھی بمبئی میں اپنا اجلاس منعقد کیا۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کا ایک گروہ یہ چاہتا تھا کہ اس نازک دور میں لیگ اور کانگریس میں کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ دوسرے گروہ کا یہ خیال تھا کہ اس قسم کا سمجھوتہ ایسے نازک موقع میں مسلمانوں کے قومی اور سیاسی مفاد کیلئے بہت غیر مفید ثابت ہوگا۔ اس اختلاف نے ایک فساد کی صورت اختیار کر لی اور مسٹر مظہر الحق نے معاملہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اسی وقت جلسہ بند کر دیا۔ ادھر کانگریس نے اس مسئلہ کا حل سوچنے کے لئے مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ایک کمیٹی بنا دی۔

یورپ میں جنگ کے شعلے بجھ چکے تھے اور ۱۹۱۷ء میں ہندوستان کو کچھ اصلاحات ملنے کی اُمید تھی اور کانگریس پوری قوت کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی لیکن یہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے تعاون کے بغیر اسے حاصل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ کانگریس مسلمانوں کی تالیف قلوب کی بھی کوشش کرے۔ مسلمان بھی اس موقع سے چونکہ فائدہ اُٹھانے پر تُلے ہوئے تھے۔

اس لئے دونوں قوموں کے اتحاد کیلئے ملک کی سیاسی فضا بہت سازگار نظر آنے لگی تھی۔
۱۹۱۶ئہ میں کلکتہ میں سر سریندر ناتھ بنرجی کی زیر صدارت مسلم لیگ اور کانگریس کا ایک
مِلا جُلا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح نے جو دل سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی
تھے بہت بڑی سرگرمی دکھائی اور انہی کے زیر ہدایت ایک "میثاق" تیار کیا گیا جو بعد میں
مسلم لیگ نے اپنے اس اجلاس میں جو لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۶ء کو مسٹر جناح کی صدارت
میں ہوا تھا قبول کر لیا۔ اور کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں جو ۲۶ر دسمبر ۱۹۱۶ئہ کو
منعقد ہوا اس پر مہر تصدیق لگا دی ⁂

"میثاق لکھنؤ" مسلم لیگ اور کانگریس کی تاریخ میں ایک بہت اہم معاہدہ ہے۔
کانگریس روزِ اوّل سے اس کوشش میں تھی کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں من حیث القوم
کوئی سیاسی اہمیت اور انفرادیت حاصل نہ ہو۔ ادھر مسلمان اپنی اسلامی تہذیب۔
اسلامی کلچر اور تمدن کی شاندار یادگار فراموش کر لینے پر کسی قیمت پر بھی آمادہ نہیں تھا۔
اس میں کلام نہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی ایک خوفناک اکثریت ہے۔ مغل فرمانروا
جنہیں تنگ نظر ہندو مؤرخ متعصب کہتے ہیں اگر واقعی متعصب ہوتے تو آج ہندوستان
میں ہندو آٹے میں نمک برابر نظر آتے۔ مغلوں کی بے تعصبی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے
کہ مغلوں کے عہد میں ہندو کڑوی بیل کی طرح پھُولے پھلے اور مغلوں کی عنایات سے یہاں تک
مرعوب ہوئے کہ بڑے بڑے راجپوت راجوں نے اپنی بیٹیاں مغل شہزادوں سے بیاہ دیں۔
لیکن تنگ نظر ہندو مؤرخ ان باتوں کو ہمیشہ بھُول جاتا ہے لیکن آج واقعات کی رَو کو دیکھتے
ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مغل شہنشاہوں کی یہ واداری مسلمانوں کیلئے مفید نہ تھی۔
مسلمان بادشاہوں کا سب سے بڑا فرض تبلیغ اسلام تھا اور ہر پاسدار مسلمان کو مغل

فرمانرواؤں سے یہ گلہ رہے گا کہ وہ اس مقدس فرض کی طرف سے بالکل غافل رہے اور ان کی اس غفلت کا نتیجہ اس زمانے کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ بہرکیف! ہندوؤں نے مغل سلطنت کا چراغ گل ہوتے ہی سب سے پہلا قدم جو اٹھایا وہ مسلمان کی تخریب کی کوشش تھی لیکن گو مسلمان اقلیت میں تھے تاہم صوبہ سرحد۔ سندھ۔ بلوچستان۔ پنجاب اور بنگال میں انہیں دوسری اقوام پر اکثریت حاصل تھی اور رہے اس کے علاوہ انہوں نے کم وبیش ایک ہزار برس کے لگ بھگ بڑی شان وشوکت سے ہندوستان پر حکومت کی تھی پھر وہ یہ بھی کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے کہ اس "کفر گڑھ" میں جہاں انہی کے ایک مجاہد بھائی محمد بن قاسم نے اسلام کا جھنڈا بلند کیا تھا ان کی تہذیب اور کلچر کسی غیر کے ہاتھوں پامال ہو سکے۔ سرسید کے مدنظر بھی یہی باتیں تھیں اور ان کے مخلص جانشین بھی سرسید کے نقش قدم پر ہی چل رہے تھے ان سب کوششوں کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ایک علیحدہ قوم تسلیم کئے جائیں اور اسی لحاظ سے ان کے حقوق کی نگہداشت کی جائے لیکن کانگریس روز اول سے ہی مسلمانوں کے اس دعویٰ کی مخالفت کر رہی تھی۔ بنیا جس کی سرشت میں صرف منافع بازی ہے بہت دور کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اور انگریز کی غلامی میں بھی ملک میں رام راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ بنیا تلوار کا دھنی نہیں تھا۔ ادھر مسلمان اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہا تھا کہ جیسے بھی ہو حکومت برطانیہ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دے کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے اور یہ جماعت ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اس لئے اس جماعت کے حقوق دوسروں سے الگ ہونے چاہئیں چنانچہ مسٹر جناح ہمارے قائداعظم جو کسی زمانے میں کانگریس کی روح رواں تھے جب ہندوؤں کی معاندانہ

متعصبانہ اور غیر دیانتدارانہ چالوں سے بیزار ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو لکھنؤ میں ۱۹۱۶ئہ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجتماع کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے ببانگِ دہل یہ فرمایا کہ مسلمانوں میں بیداری کی وجہ ہندو سیاستدانوں کی وہ چالیں ہیں جو وہ انگریز سے اپنی قوم کیلئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی ہر جائز اور ناجائز طریق سے کوشش کر رہے ہیں مسلم لیگ کا سب سے مقدس فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اتنا منظم اور مضبوط کر دے کہ دوسروں کی سیاسی چالیں اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکیں ۔

"میثاق لکھنؤ" یا مسلمانوں کے سیاسی مطالبات جس پر کانگریس نے بھی مُہر تصدیق لگا دی تھی مسٹر جناح کا تیار کردہ تھا اور انہی کی کوششوں سے وجود میں آیا تھا۔ اس میثاق کی رُو سے مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا مختصراً یہ ہے کہ پنجاب کی پچاس فی صد نشستیں دی جائیں۔ بنگال میں چالیس فی صد۔ بہار میں اُنتیس فی صد۔ سی پی میں پندرہ فی صد۔ مدراس میں پندرہ فی صد اور بمبئی میں تیئیس ۲۳ فی صد نشستیں مسلمانوں کے لئے کونسلوں میں مخصوص کی جائیں۔ اسی طرح کچھ اور دفعات بھی تھیں جن سے ہندوستانیوں کے لئے انگریزوں سے بہت مفید مراعات حاصل کی گئی تھیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے میدانِ سیاست میں مسلمانوں کی یہ پہلی فتح تھی اور کانگریس کی پہلی شکست کیونکہ اس میں ہندو مسلمان کے سیاسی مفاد کا سوال نہیں تھا بلکہ دونوں قوموں کی حب الوطنی اور اخلاص کا امتحان تھا۔ اس میثاق کے مخالفوں میں پنڈت مدن موہن مالوی۔ اور لالہ لاجپت رائے پیش پیش تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی صرف یہ کوشش تھی۔ کہ مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق ہرگز تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ اس طرح سیاسی

نقطۂ نظر سے مسلمان ایک علیحدہ قوم تسلیم ہونے لگیں گے ✣

"میثاق لکھنؤ" سے ہندو اور مسلمان کے جھگڑے بظاہر مٹ گئے اور دونوں متفقہ طور پر انگریزوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ڈٹ گئے یہ سب کچھ تو ہُوا لیکن ہندو مہاسبھا نے اس "میثاق" کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان ہندو لیڈروں کو اعلانیہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا جنہوں نے مسلمانوں سے مل کر یہ میثاق تیار کیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کی بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ موجود تھا جو اس میثاق کو مسلمانوں کے قومی حقوق کیلئے مفید نہیں سمجھتا تھا مسلمان تو خیر صرف باتوں ہی میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے لیکن ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اس میثاق کے خلاف تھا۔ در پردہ کچھ اور چالیں چل رہا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش میں لگا ہُوا تھا ✣

چنانچہ اعظم گڑھ میں گائے کی قربانی کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں میں ایک خوفناک فساد ہو گیا۔ اس فساد میں مسلمانوں کو بہت جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ لیکن یہ فساد دوسرے علاقوں میں تو نہ پھیلا لیکن ہندو لیڈروں نے جو اس موقع پر خاموشی اختیار کی تو اس سے مسلمانوں میں پھر کچھ انتشار سا پیدا ہو گیا لیکن مُسلم لیگ اور کانگریس کی کمیٹی جو مسٹر جناح کی زیر ہدایت اصلاحات کی سکیم تیار کر رہی تھی اپنا کام کرتی رہی ✣

۱۹۱۷ء میں "ہوم رُول لیگ" کے نام سے دو جماعتیں قائم ہوئیں۔ ایک مسٹر تلک کی ہوم رُول لیگ دُوسری مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رُول لیگ مسٹر تلک بیحد متعصب اور کٹر مہاسبھائی ذہنیت کے آدمی تھے اس لئے ان کی

ہوم رول لیگ اپنے گہوارہ ہی میں ابدی نیند سو گئی۔ لیکن مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ ملک میں بڑی سُرعت سے کامیابی حاصل کرنے لگی اور شہر شہر اس لیگ کی شاخیں قائم ہونے لگیں۔ مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی کہ موصوفہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی رہنما تھیں۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی جو ایک نیم مذہبی سی جماعت تھی۔ پہلے سے ہی ملک کے مختلف اکناف و اطراف میں شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس ہوم لیگ کے صدر ہائی کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر سر امنی آئر تھے۔ ہوم رول لیگ نے اتنا زور پکڑا کہ آخر حکومت کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ چنانچہ جون ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسنٹ کو نظر بند کر دیا گیا۔ مسز اینی بیسنٹ کی نظر بندی کے بعد مسٹر جناح بمبئی کی ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور بڑی سرگرمی سے کام شروع کر دیا ٭

اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک دورِ انتشار تھا۔ ایک طرف تو وہ سیاست کے میدان میں بڑی پامردی سے کام کر رہے تھے دوسری طرف انہیں یہ اندیشہ دامنگیر ہو رہا تھا کہ برادرانِ وطن ہر ممکن طریق سے ان کے راستہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ پھر حکومت برطانیہ نے جنگ عظیم اوّل کے دوران میں اسلامی سلطنتوں کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی مسلمانان ہند کیلئے وہ بھی کچھ کم باعثِ اضطراب نہ تھی۔ انگریزوں نے عربوں کو شہ دے کر نہ صرف ترکوں کو ہی نقصان پہنچایا بلکہ اس شاطرانہ چال سے عربوں کو بھی کمزور کر دیا تھا ٭

مسلم لیگ کے ۱۹۱۷ء کے اجلاس کی صدارت کیلئے مجاہد اسلام حضرت مولانا محمد علی کو منتخب کیا گیا لیکن وہ اس وقت اسیر فرنگ تھے اس لئے اس

اجلاس کیلئے راجہ صاحب محمود آباد پہنچ گئے۔ راجہ صاحب نے اس موقع پر بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی حالت پر روشنی ڈالی اور کانگریس یا ہندوؤں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیا۔ اس جلسے میں چند بہت مفید اور ضروری قرار دادیں بھی منظور ہوئیں جن میں ہندوؤں کی تعصبانہ روش کی کھلے بندوں مذمت کی گئی۔ دوسرے اس بات پر زور دیا گیا کہ جن صوبوں میں اُردو زبان اور فارسی رسم الخط رائج ہے۔ اسے حسب سابق جاری رکھا جائے اور اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی غلامی سے آزاد ہوتے ہی اُردو زبان کے خلاف قلم اور زبان سے پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا اور جب ہندو مہا سبھا وجود میں آئی تو مسلمانوں کی مخالفت کا کام بڑے دھڑلے سے شروع کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں دہلی میں مسٹر فضل حق صاحب کی صدارت میں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہوا اس میں ڈاکٹر انصاری نے ہندو مسلم فسادات کی مذمت کرتے ہوئے صرف ہندوؤں کو ہی ان فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان تو ملک کے سُود اور بہبود کیلئے اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر کام کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندوؤں کی روش بہت قابلِ اعتراض ہے ؎

جنگ یورپ ۱۹۱۸ء میں ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اسلئے جرمنی کے ساتھ ترکی کو بھی شکست ہوئی اور تباہی بھی زیادہ تر ترکی پر ہی آئی۔ ترکوں سے عرب۔ عراق۔ شام اور فلسطین چھین لئے گئے۔ یورپ میں تھریس ترکوں سے لے لیا گیا۔ اور ترکی کے دارالخلافہ قسطنطنیہ پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا۔ پیرس میں صلح کی کانفرنس منعقد ہوئی تو مسلمانوں کو یہ خدشہ ہونے لگا۔

کہ کہیں اتحادی ترکی میں خلافت ہی کو نہ ختم کر ڈالیں کیونکہ خلافت اب انگریزوں
کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم "خلافت کے متعلق مسلمانانِ ہندوستان
کی سرگرمیوں کا ذکر کریں۔ کچھ ترکوں کے متعلق بھی بیان کر دینا شاید غیر مناسب
نہ ہو۔ پروفیسر "ولفورڈ کنٹول سمتھ" اپنی کتاب "ماڈرن اسلام اِن انڈیا" میں
خلافت کے متعلق اپنا تعصبانہ نقطہ نگاہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انیسویں
صدی کے اختتام پر خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید نے ایک بار پھر اپنے اقتدار
کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس کے لئے "پان اسلامک" تحریک ملک میں شروع
کر دی۔ اس تحریک میں تقریباً تمام دُنیا کے مسلمانوں نے کم و بیش حصّہ لیا۔ "پان
اسلامک تحریک" سے سلطان اپنی سلطنت کو اپنے ہی ملک کی اندرونی سازشوں
سے محفوظ رکھنے کی بھی تدبیر کرنے لگا کیونکہ اس وقت خود ترکی میں ہی خلافت کے خلاف
ایک "ڈیموکریٹک پارٹی" بن چکی تھی۔ اور بڑے بڑے با اثر لوگ اس میں شامل ہو
چکے تھے لیکن ۱۹۰۸ء میں "ینگ ترکی پارٹی" نے خلیفہ کو معزول کر دیا۔ خلیفہ
یعنی سلطان کے معزول ہونے سے نہ خلافت رہی اور نہ "پان اسلامک تحریک"
لیکن چار سال بعد یہ تحریک پھر ایک بار ہندوستان میں زندگی کے آثار دکھلانے
لگی۔ اس وقت یورپ میں ایک طرف ترکی اور اٹلی میں لڑائی ہو رہی تھی دُوسری
طرف یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں نے بلقان میں ترکوں کے خلاف جنگ کے
شعلے بھڑکا رکھے تھے۔ اور ترکوں کے خلاف جس قدر تحریکیں اس وقت کام کر
رہی تھیں ان میں برطانیہ سب سے پیش پیش تھا اور مسلمانوں کو یہ خوف ہونے لگا
تھا کہ انگریز نہ صرف یورپ ہی میں بلکہ تمام دُنیا میں مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ

ان کی اسلامی کلچر کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے ایک طرف عام مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا دوسری طرف شبلیؔ۔ اکبرؔ اور اقبال نے لوگوں کے جذبات کو اُبھارا۔ خصوصیت سے علامہ اقبال نے شکوہ لکھ کر وہ کام کیا جو صدیوں میں بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی طرح کلکتہ میں الہلال نے مسلمانوں کے جذبات اُبھارنے کا کام بڑی خوبی سے کیا اور صرف چھ ماہ کے قلیل عرصے میں الہلال کی اشاعت گیارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ الہلال صرف مسلمانوں کے جذبات کو ہی نہیں اُبھارتا تھا بلکہ بڑی بیباکی سے برطانیہ کی مسلم آزار پالیسی پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتا تھا۔ اسی طرح پنجاب (لاہور) میں روزنامہ زمیندار نے بھی اس نازک موقع پر مسلمانوں کی قلمی خدمات کرنے میں بڑی سرگرمی دکھلائی۔ اور زمیندار کی اشاعت بیس ہزار روزانہ تک پہنچ گئی۔ مولانا محمد علی نے انگریزی میں کامریڈؔ اور اردو میں "ہمدرد" اخبار نکالا۔ دونوں اخبار دہلی سے شائع ہوتے تھے۔ ان دونوں اخبارات نے مولانا محمد علی کی زیرادارت مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا کر دی۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی کی کوششوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ترکوں کی طبی امداد کے لیئے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک "ریڈ کریسنٹ مشن" ٹرکی بھیجا گیا۔ اور مسلمانانِ ہندوستان نے بڑی دریا دلی سے اس کارِ خیر کیلئے مالی مدد دی۔ ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی اور سیاسی حالات نے ترکوں کو اتحادیوں کی مخالف صف میں کھڑا کر دیا۔ اور حکومتِ ہند نے مسلمانوں کے عام اخبارات پر پابندی عائد کر دی اور ان کے ایڈیٹروں اور دوسرے مسلمان لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا۔ حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے ملک میں ایک انقلابی تحریک کے آثار نظر آنے

لگے خصوصیت سے پنجاب میں۔ ۱۹۱۷ء میں "رولٹ کمیشن" مقرر کیا گیا۔ مسلمان عوام الناس پہلے ہی حکومت سے بدظن تھے۔ اب مسلمان فوجی سپاہیوں میں بھی بیچینی اور بے دلی پھیلنے لگی ہندوستانی فوج میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ گو ۱۹۱۷ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کو "سیلف گورنمنٹ" کے سبز باغ دکھانے کی بھی کوشش کی لیکن ملک کی سیاسی حالت میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔ عین اس وقت جب ہندوستانی نئی اصلاحات کی آس لگائے بیٹھے تھے "رولٹ بل" وجود میں آیا۔ "رولٹ بل" کا مقصد صرف یہ تھا کہ ملک میں جو بدامنی یا بیچینی پیدا ہوچکی ہے اسے سختی سے دبا دیا جائے۔ اس موقع پر مسٹر گاندھی نے جو کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر تھے "ستیاگرہ" کی تحریک شروع کردی چنانچہ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء میں ملک کے طول و بلد میں "ستیاگرہ" کی تحریک منائی گئی اور ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات بھول کر ہر جگہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش نظر آنے لگے اور "چھوت چھات" کا سوال بھی پس پشت ڈال دیا گیا پھر امرتسر میں "جلیانوالہ باغ" کا بیحد افسوسناک اور شرمناک واقعہ پیش آیا جس میں بے شمار ہندو اور مسلمان جنرل ڈائر کی فوج کی گولیوں سے مارے گئے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے مسلمانوں کی آنکھیں خلافت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی چار سال قید و بند کی کڑیاں جھیلنے کے بعد جیلوں سے نکلے۔ اس وقت ہندوستان میں "خلافت کمیٹی" قائم ہوچکی تھی۔ جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کو جب فتح حاصل ہوئی تو حکومت برطانیہ نے ترکوں کے متعلق جو وعدے مسلمانوں سے کر رکھے تھے بالکل فراموش کر دیئے۔ مسٹر لائیڈ جارج نے

جو اس وقت سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے ترکوں کے سامنے جو صلح کی شرائط پیش کیں بہت ذلت آمیز تھیں۔ انگریزوں کی اس معاندانہ روش سے مسلمانوں میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اس وقت "خلافت کمیٹی" کے علاوہ "جمعیتہ العلما ہند" کے نام سے مسلمانوں میں ایک اور جماعت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ "تحریک خلافت" کے رُوحِ رواں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تھے۔ مسلم انڈیا کے سیاسی آسمان کے ان دو درخشندہ ستاروں نے اپنی آب و تاب سے ہر مرد مومن کے دل میں اسلام کی تڑپ پیدا کر دی۔ کچھ روز بعد مسٹر گاندھی نے بھی تحریک خلافت میں مسلمانوں سے ہمدردی کا عملی اظہار کیا۔ مسلمان تلک کے تعصّب اور تنگ نظری سے ہندوؤں سے بہت ناراض تھے۔ لیکن گاندھی ایک شریف طبیعت اور راسخ العقیدہ آدمی تھا۔ اس کے دل میں بنی نوع انسان کا درد تھا۔ اس میں رواداری تھی اور انہیں ہمسائگی کا بھی بہت پاس تھا۔ گاندھی جی نے بہت جلد مسلمانوں کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا ؂

انگریزوں یا اتحادیوں نے انگریزوں کی تحریک سے ترکی کے حصّے بخرے کر ڈالے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی اور چند دیگر اکابر مسلمان خلافت کا نظریہ پیش کرنے کے لئے انگلستان گئے۔ لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی اور یہ وفد بے نیل و مرام واپس آگیا۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزوں کے خلاف "تحریک ترک موالات" شروع کر دی لیکن بعض مسلمان لیڈر اس تحریک کو مسلمانوں کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اس سے مسلمان کی انفرادیت پر بھی ضرب پڑنے کا اندیشہ تھا۔ بہر کیف! تمام ہندوستان میں ہندو

مسلم اتحاد کے دل خوش نظارے نظر آتے تھے۔ ہر طرف سے اتحاد! اتحاد کی جانفزا آواز فضا میں گونجتی سنائی دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن اہل نظر مسلمان یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ اتحاد حبِّ علی پر نہیں بلکہ بغض معاویہ پر ہے اور بعد کے واقعات نے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی۔ کیونکہ اس اتحاد سے ہندو لیڈروں کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جوش سے فائدہ اُٹھا کر پہلے انگریز کو نیچا دکھایا جائے پھر ہندوستان میں اپنی اکثریت کے بل بوتے رام راج قائم کیا جائے۔ "ترک موالات" کی مخالفت کرنے والوں میں مسٹر جناح سب سے پیش پیش تھے اور وہ اس تحریک کو ہر نقطہ نظر سے اسلامی مفاد کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے ترکوں سے جس صلحنامے پر دستخط کرائے وہ اتنا توہین آمیز تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غصّے اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمان گاندھی جی کی تحریک ترک موالات میں اندھا دُھند شامل ہونے لگے اور مسلم لیگ کو بھی بخوشی یا مصلحتاً اس میں شامل ہونا پڑا۔ اسی سال کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس میں دو بڑے اہم ریزولیوشن پاس ہوئے۔ ان میں سے ایک "سوراج" حاصل کرنے کیلئے تھا۔ دوسرا "خلافت" کی بحالی کیلئے ؛

۱۹۲۰ء کے گرمیوں کے موسم میں ہندوستان میں "ہجرت" کی تحریک پھیلی اور ہندو راہنماؤں نے اس تحریک کو بہت ہوا دی۔ مسلمانوں کی بدقسمتی سے مسلمانوں کے چند مذہبی رہنماؤں نے عوام میں یہ بدظنی پھیلانی شروع کر دی کہ ہندوستان میں مسلمان مذہبی آزادی کے ساتھ چونکہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے اُنہیں یہاں سے ہجرت کر کے کسی اور اسلامی ملک میں چلے جانا چاہیئے اور

اس کے ساتھ یہ لقمہ بھی دیا کہ افغانستان کا بادشاہ اور افغانستان کی حکومت اپنے مہاجر بھائیوں کو لبیک کہنے کو آنکھیں فرش راہ کئے بیٹھی ہے۔ سادہ لوح مسلمان خصوصیت سے غریب طبقہ اس بھرّے میں آسانی سے آگیا اور ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن تھوڑے ہی روز بعد مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا اور یہ سلسلہ بند ہو گیا ÷

جنوبی ہندوستان کے وہ مسلمان جو ساحل مالا بار کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور "موپلے" کہلاتے ہیں اور فطرتاً ایک بہادر قوم متصور ہوتے ہیں ان لوگوں کی معاشی حالت ہمیشہ خراب رہی ہے اور حکومت بھی ہمیشہ تساہل سے کام لیتی رہی ہے سب سے پہلے موپلوں نے ۱۸۷۳ء میں سر اٹھایا۔ اور حکومت نے ان کی سرکوبی کے لئے ان کے علاقوں میں مستقل طور پر فوجی چھاونیاں قائم کر دیں پھر ۱۸۸۵ء ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۶ء میں ان لوگوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے اور ہر موقع پر فوجی طاقت سے اس قسم کی شورش کو دبا دیا گیا ÷

۱۹۲۱ء کے شروع میں "تحریک ترک موالات" اور تحریک خلافت سے یہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ حکومت نے بھی روک تھام کا فوری انتظام کیا اور طرح طرح کی پابندیاں لوگوں پر عائد کر دیں لیکن یہ لوگ درونِ خانہ اپنے کام میں لگے رہے اور آخر ایک روز کھُلّم کھُلّا حکومت کے خلاف بغاوت کر دی گئی۔ روزانہ کشت و خون کا ہنگامہ گرم رہا لیکن انگریز اس فساد کو دبانے میں پھر ایک بار کامیاب ہو گئے ÷

تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت ہی کے سلسلہ میں علی برادران کو پھر

ایک بار جیلوں میں بند ہونا پڑا اور ان کے ساتھ کم و بیش تیس ہزار ہندوستانی بھی جیلوں میں ٹھونسے گئے۔ آخر فروری ۱۹۲۲ء میں یہ تحریک ترک موالات بند کر دی گئی۔

"خلافت کمیٹی" کا مطالبہ یہ تھا کہ عرب۔ شام اور عراق پر خلیفہ کا اقتدار پہلے کی طرح قائم رہے۔ اس وقت ترکی میں سلطان محمد ششم سلطان بھی تھا اور خلیفہ بھی لیکن مصطفےٰ کمال پاشا اور اس کی نئی پارٹی نے سلطان محمد ششم کو معزول کر کے اس کی جگہ اس کے بھتیجے عبدالمجید خاں کو خلیفہ بنا دیا۔ ۱۹۲۲ء میں کرسمس کے ایام میں گیا میں خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلما ہند کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں مسلمانان ہندوستان نے متفقہ طور پر اس نئی تبدیلی کا خیر مقدم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانان ہندوستان کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جہاں تک ترکوں کی خلافت کا معاملہ ہے ان کی جدوجہد کچھ ایسی مؤثر اور مفید نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خلافت کانفرنس کا کام کچھ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو گیا۔

۱۹۲۳ء کی گرمیوں میں حکومت ہندوستان نے بہت سے مسلم اکابر کو رہا کر دیا۔ مولانا محمد علی جیل سے نکلتے ہی ہندوستان کی تحریک آزادی کے بہت سرگرم رکن بن گئے۔ اس وقت ملک میں دو سیاسی جماعتیں قائم تھیں۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ تھا کہ برطانوی راج کی ہر ممکن طریق سے مخالفت کی جائے۔ اس پارٹی کے لیڈر مولانا محمد علی تھے۔ دوسری پارٹی کا خیال یہ تھا کہ حکومت سے تعاون کیا جائے۔ اور لیجسلیٹو کونسلوں میں شمولیت کی جائے لیکن ہوا وہی جو مولانا محمد علی چاہتے تھے لیکن واقعات بڑی تیزی کے ساتھ کروٹ لے رہے تھے سیاسی لیڈروں میں اصولی اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور تحریک خلافت جس کے روح رواں

صرف علی برادران تھے۔ ملک کی سیاسی آغوش میں اونگھ رہی تھی۔ اِدھر یورپ سے ایک اور سنسنی خیز خبر آئی۔ ترکوں نے سلطان عبدالمجید خاں کو معزول کر کے کہیں یورپ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور خلافت ختم کر دی ؁

۱۹۲۴ء میں ملک میں پھر فرقہ دار تحریکیں پورے زور سے شروع ہو گئیں اور ہندو اور مسلمانوں میں آئے دن فساد ہونے لگے۔ ان سب فسادات کی تہ میں کانگریس تھی۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ الٰہ آباد۔ کوہاٹ میں بہت زیادہ فسادات ہوئے اور ہر جگہ مسلمانوں نے اپنی تنظیم سے غافل رہنے کی وجہ سے بہت نقصان اٹھایا۔ مسٹر گاندھی نے ان فسادات سے متاثر ہو کر برت رکھا۔ اور پھر ایک بار ہندو مسلم اتحاد کانفرنس کا سوانگ ملک میں رچایا گیا۔ ہندوؤں سے یہ کہا گیا کہ وہ مساجد کے سامنے باجا نہ بجایا کریں۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ وہ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے گاؤکشی کی رسم ترک کر دیں لیکن یہ سب کوششیں محض اس لئے بیکار رہیں کہ ہندو مسلمانوں کی قومی انفرادیت اور سیاسی اہمیت تسلیم کرنے پر مطلقاً راضی نہ ہو سکے۔ دونوں قوموں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کیلئے چند ہندو اور مسلمان لیڈروں نے ۱۹۲۵ء میں " آل پارٹیز کانفرنس " کی بنیاد ڈالی۔ مسٹر محمد علی جناح جو روزِ اوّل سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے بڑے سرگرم حامی تھے۔ آل پارٹیز کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ہندو کی ذہنیت بدلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ثابت ہؤا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس نے ہندو مسلم سوال بالکل نظر انداز کر دیا۔

اور وہ مسلمان جو کانگریس کے ممبر تھے منہ دیکھتے رہ گئے اور مسلمانوں کی نگاہ میں جو ان کا رہا سہا وقار تھا وہ بھی نہ رہا۔

لیکن قدرت بھی مسلمانوں کے لئے نت نئے روز ایک نہ ایک نیا قضیہ برابر اُٹھائے رکھتی تھی۔ حجاز میں شریف حسین غدار اور ابن سعود میں جنگ چھڑ گئی اور اور مقامات مقدسہ کا سوال پیدا ہو گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ فکر ہونے لگا کہ اب وہ کس کا ساتھ دیں۔ "خلافت" کے ختم ہو جانے سے ہندوستان کی خلافت کمیٹی ایک بیجان سی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا اور مسلمانوں کے انتہا پسند لیڈروں کو سُکھ کا سانس لینے کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں کے یہ وہی لیڈر تھے۔ جنہوں نے ۱۹۱۸ء میں ہندوؤں کا سیاسی نقطہ نظر قوم کی آواز کے خلاف منظور کر لیا تھا لیکن نتیجہ پھر بھی کچھ نہ نکلا اور رفتہ رفتہ انتہا پسند مسلمان لیڈروں کا اقتدار کم ہوتا گیا۔

ہندوستان میں اسوقت دو اہم سیاسی جماعتیں تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ۔ کانگریس پر تمام ہندوؤں کو اعتماد تھا لیکن مسلم لیگ کچھ مسلمانوں میں بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ اس لئے سیاسی نقطہ نظر سے ہندوستان میں کانگریس کا وجود بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اور گو کانگریس اس بات کی دعویدار تھی کہ وہ ہندوستان کی تمام اقوام کی واحد نمائندہ ہے تاہم ہندوستان سے باہر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو یہ دعویٰ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کانگریس کے ہر دَور میں کچھ مسلمان بھی اس میں شامل رہے۔ کیوں شامل رہے؟ اس کی کئی

ایک تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں کانگریس کو ہی ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی سے کچھ مسلمان علماء دین بھی کانگریس کے ہم خیال تھے۔ ان میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد تھے اور دوسرے مولوی حسین احمد مدنی۔ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کی صحیح جماعت سے الگ ہو کر مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ مولوی حسین احمد مدنی کی ایسی ہی مسلم آزار سرگرمیوں سے بیزار ہو کر حکیم الملت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے فرمایا تھا ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ

ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

لیکن اس قسم کے مولویوں نے چونکہ دین پر دُنیا کو ہمیشہ اولیت دی ہے۔ اس لئے ان سے گلہ ہی کیا۔ حسین احمد مدنی تو خیر جس مسلک کے تھے وہ تو ایک دنیا کو معلوم ہے لیکن سب سے زیادہ افسوس تو مولانا ابوالکلام آزاد پر ہے۔ عالم اسلام کی ایک اتنی مقتدر ہستی کا مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر ہندوؤں کا ہم نوا ہو جانا مسلمانوں کی بدنصیبی ہے اگر آج عالم اسلام کا یہ برگزیدہ فرزند مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو شاید کسی روز امیرِ ملت کے نام سے یاد کیا جاتا ؞

لیکن جہاں مسلمانوں میں مولوی حسین احمد مدنی ایسا ملت فروش آدمی پیدا ہوا ویسے ہی اسلام کے سیاسی مطلع پر ہندوستان میں مولانا عبیداللہ سندھی جیسا تابدار ستارہ بھی طلوع ہوا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ایک آتش زبان مقرر اور جادو بیان واعظ تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر صرف اس کام کیلئے وقف کردی تھی کہ اسلام کی عظمت کا نہ صرف ہندوستان میں ہی بلکہ تمام دنیا میں پھر ایک بار ڈنکا بجے یعنی وہ مقصد جو حضرت جمال الدین افغانی کے مدنظر تھا اسی کے وہ بھی ترجمان تھے۔ لیکن جس طرح حضرت جمال الدین افغانی کو اس مقدس مقصد کے لئے جلاوطنی کی کڑیاں جھیلنی پڑیں اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھی جیسا بطل حریت بھی حکومت کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکا چنانچہ مولانا موصوف کو اپنی اسلامی سرگرمیوں کے باعث ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۹ء تک وطن سے باہر رہنا پڑا اور انہی ایام میں آپ روس بھی تشریف لے گئے جینوا بھی گئے اور ممالک عرب میں بھی قیام پذیر رہے اور ہر جگہ اپنی آتش زبانی سے مسلمانوں میں اسلام کی روح کو زندہ کر دیا۔ افسوس کہ ۱۹۴۴ء میں عالم اسلام کا یہ مایۂ ناز فرزند قبر کے گوشہ میں جا چھپا۔

مسلمانوں میں حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری اور چوہدری خلیق الزماں نے بھی مسلم لیگ اور مسلمانوں کی بڑی شاندار خدمات انجام دیں۔ یہ سب بزرگ ایک عرصہ تک کانگریس کے دامن سے وابستہ رہ چکے تھے لیکن ہندو لیڈروں کی تنگ نظری کے باعث کانگریس سے کٹ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے ہم آرہ اور کتارپور کے ہندو مسلم فسادات کو نہیں بھول سکتے۔ ان ہر دو مقامات پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔ ہندوؤں کے ظلم سے نہ بوڑھے بچے نہ معصوم جانیں محفوظ رہ

سکیں نہ عورتوں کا پاس کیا گیا۔ ہندوؤں کے اِن مظالم سے ہندوستان کے طول و بلد میں ایک تھلکہ سا پڑ گیا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے سندھ۔ پنجاب۔ بنگال۔ اور صوبہ سرحد میں جہاں ان کی اکثریت تھی ان مظالم کا کیا جواب دیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی زیر صدارت امرتسر میں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہؤا اس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ چونکہ گائے کی قربانی سے ہمارے ہندو بھائیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے اس لئے مسلمانوں کو گائے کی قربانی پر دوسرے جانوروں کو ترجیح دینی چاہئے۔ یہ تھی مسلمانوں کی رواداری لیکن اس رواداری کا جواب ہندوؤں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ سوامی شردہانند نے "شدھی کی اشتعال انگیز تحریک شروع کر دی"

۱۹۲۷ء میں "سائمن کمیشن" کی آمد آمد کا ہندوستان میں چرچا ہونے لگا۔ اس سے ہندو مسلم کشیدگی میں خود بخود ایک خوشگوار تغیر نمودار ہو گیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں قومیں اپنے اختلافات اور کشیدگیاں بھول گئی ہیں۔ ۳، فروری ۱۹۲۸ء کو سر جان سائمن کی قیادت میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ اور ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر اس کے خلاف آواز بلند کی اور ہر طرف سے "واپس جاؤ" کے نعرے سنائی دینے لگے

اس وقت وزارت برطانیہ میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند تھے۔ انہوں نے "سائمن کمیشن" مقرر کر کے ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ متحد ہو کر جدید آئین کے لئے کمیشن کے سامنے اپنی تجاویز پیش کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ گو انہیں اُمید نہیں کہ دونوں قومیں کسی تجویز پر متحد ہو سکیں ہندو مسلمانوں کے "سائمن کمیشن" سے عدم تعاون کرنے کی بادی النظر میں یہی سب سے بڑی وجہ

تھی اور اس لئے دونوں قومیں پھر ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں اور دونوں قوموں کے لیڈر دل سے یہ چاہنے لگے تھے کہ کوئی ایسا آئین مرتب کیا جائے جس سے دونوں قوموں کے حقوق کی پوری پوری نگہداشت ہو سکے ؛

اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) نے اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے۔ مثلاً صوبوں کو کامل خود مختاری - ہر صوبے میں اقلیتوں کو مؤثر نیابت۔ مرکزی مجالس میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو۔ تمام قوموں کو مذہبی آزادی۔ سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی۔ حکومت کے ذمہ دار عہدوں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا مناسب حصہ۔ اسلامی کلچر۔ اسلامی تہذیب اور تمدن کی حفاظت اور مسلمانوں کی زبان (اردو) رسم الخط اور قانون شریعت اسلام کے لئے حکومت کا تعاون کسی صوبہ کی وزارت میں ⅓ سے کم مسلمانوں کی نیابت نہ ہو وغیرہ وغیرہ - مسٹر محمد علی جناح کے یہ چودہ نکات ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں مولانا محمد علی نے جو اس دور میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سیاسی رہنما تسلیم ہوتے تھے ان نکات کا بڑی سرگرمی سے خیر مقدم کیا۔ لیکن ہندو سیاست دانوں نے پھر اڑیل ٹٹو کی صورت اختیار کر لی۔ اور ان تمام تجاویز کو جن سے ہندوؤں کی سرگرمیوں یا ارادوں پر زد پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر نے جو ایک بہت معاملہ فہم اور معقول طبیعت ہندو تھے اپنے اثر سے مسٹر محمد علی جناح کے یہ چودہ نکات آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے منظور کرا لئے گو ہندو مہاسبھا پورے زور کے ساتھ اس کے خلاف آواز بلند کرتی رہی ؛

بہرکیف "سائمن کمیشن" بھی اپنا کام کرتا رہا۔ ابھی سر جان سائمن نے اپنی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش نہیں کی تھی کہ لارڈ برکن ہیڈ نے ایک اور تقریر کر ڈالی اور اس میں ہندوستانیوں کو یہ طعن دیا کہ حکومت برطانیہ تو ہندوستان کو آزادی دینا چاہتی ہے لیکن خود ہندوستانیوں میں اتنا اختلاف ہے کہ وہ متفقہ طور پر کوئی ایسی سکیم پیش نہیں کر سکتی۔ ہندوستان میں "سائمن کمیشن" کے خلاف پہلے سے ہی اظہار ناراضگی کیا جا رہا تھا۔ اس چوٹ سے ہندوستانی لیڈر اور بھی برہم ہوئے چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی گئی اور اس کمیٹی میں سب قوموں کے نمائندے لئے گئے لیکن چند روز کی کارروائیوں کے بعد ہی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سب کے سامنے آ گئی کہ مسٹر جناح کے چودہ نکات جنہیں کانگریس بھی تسلیم کر چکی ہے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں اور ایک ایسی سکیم تیار ہو رہی ہے جس سے مسلمانوں کو مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" لکھنؤ میں "آل پارٹیز کانفرنس" کے سامنے جب پیش ہوئی تو اس وقت اتفاق سے مولانا محمد علی اور مسٹر جناح دونوں ہندوستان میں موجود نہ تھے۔ مولانا شوکت علی نے خلافت کانفرنس کی طرف سے "نہرو رپورٹ" کی پُر زور الفاظ میں مخالفت کی۔ کچھ روز بعد مولانا محمد علی یورپ سے واپس تشریف لے آئے اور انہوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو اس رپورٹ کی مسلم آزار پالیسی کی طرف توجہ دلائی لیکن پنڈت صاحب اپنی بات پر اڑے رہے اور مولانا محمد علی نے صاف الفاظ میں مسلمانوں کو اس رپورٹ کے نقصان رساں پہلوؤں سے خبردار کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ مسلمان کسی قیمت پر بھی نہرو رپورٹ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں کلکتہ میں کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت مسٹر محمد علی جناح یورپ سے واپس تشریف لا چکے تھے۔ گو انہیں یہ علم تھا کہ ان کے چودہ نکات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے تاہم وہ "نہرو رپورٹ" کے حق میں ہو گئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کیلئے سر علی محمد خاں مہاراجہ آف محمود آباد منتخب ہوئے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا جلسہ کلکتہ میں ہُوا۔ اور مہاراجہ صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کو "نہرو رپورٹ تسلیم کر لینے کا مشورہ دیا۔ خلافت کانفرنس مخالف تھی اور مسلم لیگ نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا آخر فیصلہ یہ ہُوا کہ کانگریس کی طرف سے جو ایک نیشنل کنونشن منعقد ہو رہی ہے اس میں مسلم لیگ کے اکابر بھی شامل ہوں۔ اور اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ ۱۹۲۷ء میں مسٹر محمد علی جناح نے جو چودہ نکات پیش کئے تھے۔ نہرو رپورٹ میں ان کا کہاں تک لحاظ رکھا گیا ہے۔ خلافت کمیٹی نے اپنا کوئی نمائندہ "نیشنل کنونشن" کیلئے نہیں بھیجا۔ "نیشنل کنونشن" کے اجلاس میں مسٹر جناح نے ایک ایسی پُر زور تقریر کی کہ ہندو نمائندوں کے سر جھک گئے اور سر تیج بہادر سپرو نے مسٹر جناح کے دلائل کی تائید کرتے ہوئے ہندوؤں کو یہ مشورہ دیا کہ انہیں مخالفت کا راستہ چھوڑ کر مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیئے لیکن ہندوؤں کے انتہا پسند گروہ نے سر سپرو کی سخت مخالفت کی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کھڑے ہو کر یہ دھمکی دے دی کہ اگر نہرو رپورٹ تسلیم نہ کی گئی۔ تو وہ کانگریس کی صدارت سے الگ ہو جائینگے۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے "نہرو رپورٹ" کے پاس ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح پھر ایک بار کانگریس اور مسلم لیگ میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اور ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کو دہلی میں مسٹر جناح کی صدارت

میں مسلم لیگ کا اجلاس ہؤا اور مسلم لیگ نے "نہرو رپورٹ" تسلیم نہ کرنے کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ جب تک مسٹر جناح کے چودہ نکات تسلیم نہ کئے جائینگے مسلمان کسی دستوری حکومت کو تسلیم نہیں کرینگے ؛

کانگریس نے نہرو رپورٹ منظور کرنے کے ساتھ ہی حکومت کو بھی یہ نوٹس دے دیا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر نہرو رپورٹ پر عمل نہ کیا گیا تو کانگریس سول نافرمانی شروع کر دیگی۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں دریائے راوی کے کنارے لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہؤا اور اس کے صدر کانگریس کے جذباتی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو منتخب ہوئے۔ اور مسٹر گاندھی کی تحریک سے کانگریس نے "سول نافرمانی" کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ اور جمیعتہ العلما کے چند اراکین نے بھی گاندھی جی کا ساتھ دیا باقی سب مسلمان اس سے الگ رہے۔ اس وقت "لارڈ ارون" ہندوستان میں وائسرائے تھے۔ آپ ایک شریف طبع انسان ہوتے ہوئے کمزور بھی تھے اور ان کی اس کمزوری سے کانگریس کو شہ ملی۔ اور سول نافرمانی کا ریزولیوشن پاس کرنے اور ملک میں فتنہ وفساد برپا کرنے کا حوصلہ ہؤا ؛

اس وقت برطانیہ میں "کنزرویٹو پارٹی" برسر اقتدار تھی۔ مئی ۱۹۲۹ء میں پارلیمنٹ میں نئے انتخاب ہوئے۔ کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہوئی اور مزدور جماعت برسر اقتدار آگئی اور لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم بنے۔ انگلستان میں وزارت کی تبدیلی سے لارڈ ارون کچھ روز کے لئے نئی وزارت سے ہندوستان کے معاملہ پر مشورہ کرنے کو انگلستان چلے گئے وہاں سے واپس آکر وائسرائے نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستانی لیڈر رول

کی انگلستان میں ایک گول میز کانفرنس بلانا چاہتی ہے مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے گول میز کانفرنس کی دعوت اس شرط پر قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے اراکین کو اکثریت ملے لیکن حکومت نے یہ شرط نہ مانی۔ کانگریس نے سول نافرمانی جاری رکھی اور حکومت نے انتظامی طور پر بڑے بڑے ہندو لیڈر جیلوں میں بند کر دیئے۔ ساتھ ہی کانگریس کو نظر انداز کر کے دوسری جماعتوں کو "گول میز کانفرنس" میں شامل ہونے کی دعوت دی چنانچہ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی "گول میز کانفرنس" ہوئی۔ گو اس میں کانگریسی لیڈر تو شریک نہ ہوئے لیکن مہا سبھائی کٹڑ پارٹی بہت نمایاں تھی اور ان مہا سبھائی ممبروں نے کانگریس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے نقطہ نظر کی مخالفت کی۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو یہ "گول میز کانفرنس ختم ہو گئی اور مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ایک تقریر میں ہندوستان کو "درجہ نوآبادیات" دیئے جانے کی اُمید دلائی۔ ساتھ ہی کانگریس کو بھی سول نافرمانی بند کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ کچھ روز بعد کانگریس نے یہ تحریک بند کر دی۔ کانگریسی لیڈر رہا کر دیئے گئے۔ مسٹر گاندھی وائسرائے کو ایک دوسری "گول میز کانفرنس" منعقد کرانے پر آمادہ کرنے لگے" سول نافرمانی" بند کرنے میں کانگریس نے حکومت سے جس طرح دب کر صلح کی اس سے ملک میں کانگریس کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا جس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں بھی بڑے حسرت اور یاس انگیز الفاظ میں کیا ہے +

مسٹر گاندھی اور حکومت ہندوستان میں دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق جو خط و کتابت ہو رہی تھی اس کے نتیجہ کے طور پر لندن میں دوسری گول میز کانفرنس

کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا اور اگست ۱۹۳۳ء کے آخر میں گاندھی اور ان کی پارٹی لندن روانہ ہو گئی لیکن "گول میز کانفرنس" کے دوران میں گاندھی جی نے کچھ ایسی شرائط پیش کیں کہ انگریز سیاست دانوں کو بھی گاندھی جی کے تدبر اور فراست پر کچھ شک ہونے لگا۔ سب سے پہلے گاندھی جی نے یہ شرط پیش کی کہ اس کانفرنس میں "فرقہ دارانہ مسائل" زیر بحث نہ لائے جائیں لیکن مسلمانوں اور دوسری ہندوستانی اقلیتوں کے نمائندوں نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر گاندھی جی نے ایک موقع پر کہا کہ وہ مسٹر جناح کے چودہ نکات تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کے مطالبات کی حمایت نہ کریں۔ مسلمانوں نے یہ مطالبہ ماننے سے بھی انکار کر دیا پھر یہ کہا کہ جب تک حکومت کانگریس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم نہ کرے وہ کسی مسئلہ پر بحث نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ مطالبہ نہ حکومت تسلیم کر سکتی تھی۔ نہ دوسری سیاسی جماعتیں ماننے کے لئے تیار تھیں۔ آخر جب سب طرف سے مایوسی ہوئی تو گاندھی جی نے یہ اعلان کر دیا کہ گول میز کانفرنس میں ان کا شامل ہونا محض وقت ضائع کرنا ہے۔ اور وہ ہندوستان واپس آنے کی راہ دیکھنے لگے۔

گول میز کانفرنس کے اجلاس برابر ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی نے پھر ایک اور شرط پیش کر دی۔ وہ یہ تھی کہ وہ (گاندھی) مسٹر جناح کے چودہ نکات اس شرط پر منظور کرتے ہیں کہ ایک تو مسلمان ڈاکٹر انصاری (ڈاکٹر صاحب اس وقت کانگریس کے سرگرم ممبر تھے۔ اور مسلم لیگ کے مشہور مخالفوں میں ان کا شمار

ہوتا تھا) اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں سے یہ نکات منظور کرائے جائیں۔ دوسرے پنجاب میں مسلمان سکھوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے جائز حق سے زیادہ مراعات کا دعویٰ نہ کریں لیکن یہ دونوں شرائط بھی ناممکن العمل تھیں۔ ان اجلاس کے دوران میں گول میز کانفرنس نے ایک "مجلس اقلیت" قائم کرنے کا اعلان کیا یہ کمیٹی فرقہ وارانہ مسائل کے حل کیلئے قائم کی گئی تھی لیکن "مجلس اقلیت" کی کوششیں بھی آخر کار بیکار ثابت ہوئیں۔ آخر گاندھی جی کے مشورہ اور مسٹر نائیڈو کی تائید سے پنڈت مدن موہن مالوی اور چند دیگر ہندو راہنماؤں نے مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم سے یہ درخواست کی کہ وہ ثالث بن کر فیصلہ کر دیں۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اور صاف اور کھلے الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ مسلمان اپنے مطالبات کے لئے کوئی ثالث قبول نہیں کر سکتے۔ آخر حکومت برطانیہ نے "کمیونل ایوارڈ" کا اعلان کیا۔ گو "کمیونل ایوارڈ" سے مسلمانوں کے حقوق کی پوری پوری حفاظت نہ ہوتی تھی تاہم انہوں نے مصلحتاً اسے تسلیم کر لیا لیکن ہندوؤں نے "کمیونل ایوارڈ" کے خلاف بہت شور مچایا۔ اور گاندھی جی حکومت برطانیہ سے روٹھ کر ہندوستان واپس آ گئے۔ یہاں اس وقت لارڈ ولنگڈن وائسرائے تھے جو کسی کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ ہندوستان واپس آ کر گاندھی جی نے حسب دستور لارڈ ولنگڈن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش شروع کر دی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ لیکن ان کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے وائسرائے نے انہیں گرفتار کر لیا۔

یہ وہ وقت تھا جب اسلامی ہندوستان میں نئی نئی سیاسی یا نیم سیاسی جماعتیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ان میں سے صوبہ سرحد میں "خدائی خدمتگار" یا

سرخپوش، احرار اور نیشنلسٹ قابل ذکر ہیں:

صوبہ سرحد (شمال مغربی) میں عبدالغفار خاں نے ملک و ملّت کی خدمت کے لئے "خدائی خدمتگاروں" کے نام سے ایک جماعت ترتیب دی۔ جہاں تک واقفات کا تعلق ہے "خدائی خدمتگار" کہلانے کا تو ایک ڈھونگ ہی تھا حقیقت میں یہ جماعت صوبہ سرحد میں کانگریس کے روپے پر کانگریس کی حمایت اور پراپیگنڈہ کے لئے قائم کی گئی تھی۔ "عبدالغفار خاں" جسے کانگریس نے بعد میں "سرحدی گاندھی" کا خطاب دیا۔ کانگریس کا بڑا سرگرم رکن تھا اور اس کی کوششوں اور کانگریس کے روپے سے صوبہ سرحد میں کانگریس وزارت برسرِ حکومت آگئی۔ ۱۹۲۹ء میں جب کانگریس نے مکمل آزادی کا اعلان کیا تو یہ جماعت بھی کانگریس کے ساتھ مل گئی۔ اس صوبے میں جہاں مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی اور پٹھان ایسے غیور مسلمان کو کانگریس کا ہمنوا بنا دینا عبدالغفار خاں کا ایک بہت بڑا کارنامہ متصور ہوتا ہے۔ لیکن اسلام فروشی کے عوض "سرحدی گاندھی" کا خطاب پانا بھی کچھ کم قابل فخر نہ تھا۔

دوسری جماعت "احرار" کہلاتی تھی۔ یہ جماعت بظاہر تو مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر کی حمایت کیلئے وجود میں آئی تھی۔ لیکن ملک کی بدقسمتی سے اس کے لیڈر بہت جلد کانگریس کے طرفدار ہو گئے۔ کانگریس نے جب "آزادی" کا اعلان کیا تو "خدائی خدمتگاروں" کی طرح یہ جماعت بھی کانگریس کے ساتھ مل گئی۔ جب سول نافرمانی کی تحریک بند ہو گئی تو احراریوں نے کشمیر ایجی ٹیشن میں بڑی سرگرمی دکھائی اور کشمیر ایجی ٹیشن کے ختم ہونے پر ان لوگوں نے اپنی جماعت کو زندہ رکھنے کے لئے "مرزائیت" کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی۔ بہرکیف! جس طرح "خدائی خدمت گار"

مسلمانوں کے مفاد کیلئے غیر مفید اور ضرر رساں ثابت ہوئے۔ اسی طرح اس جماعت کے قیام سے بھی مسلمانوں کو نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہُوا ÷

"تیسری جماعت "نیشنلسٹ مسلمان" تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کانگریسی مسلمان کہلاتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں یہ جماعت وجود میں آئی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے صدر قرار پائے۔ مسلمانوں کو مولانا موصوف سے ہمیشہ یہ گلہ رہیگا کہ وہ ایک زبردست عالمِ دین ہوتے ہوئے ہمیشہ مسلمانوں کی کثرت رائے کے برخلاف کانگریس کے ہم نوا رہے۔ ان کے کانگریس کے دامن سے وابستہ رہنے سے مسلمانوں کو من حیث القوم جو نقصان برداشت کرنا پڑا اس پر مؤرخ روشنی ڈالے گا اور مولانا کا قوم سے کٹ کر ہندوؤں سے مل جانا ان کے کیریکٹر پر ہمیشہ ایک بدنما داغ بن کر چمکے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد راشٹرپتی بھی کہلائے اور کانگریس کے صدر بھی بنے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہندو قوم نے کبھی ان پر اعتماد نہ کیا ÷

مسلمانوں کی ان جماعتوں نے تو ہر قدم پر مسلمانوں کی آواز کے خلاف کانگریس کا ساتھ دیا لیکن کانگریس نے جب حکومت سے "آزادیٔ ہند" کی بات چیت شروع کی تو ان جماعتوں سے مشورہ تک کرنا اسے گوارا نہ ہُوا۔ اور حرفِ غلط کی طرح انہیں اپنے پرگرام میں سے نکال دیا۔ قوم سے غداری کرنے والوں کا انجام ہمیشہ عبرتناک ہُوا کرتا ہے ÷

اس وقت ملک میں مسلم لیگ اور کانگریس ہی صرف دو ایسی جماعتیں تھیں جو حکومت کے نقطہ نظر سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ متصور ہوتی تھیں گو کانگریس برابر ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی رٹ لگائے جاتی تھی لیکن یہ صدا

اب صدا بہ صحرا سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ دونوں جماعتوں کے سامنے اس وقت سوال یہ تھا کہ ملک میں کس قسم کی حکومت ہو۔ ہندو اور سکھ مخلوط انتخاب پر زور دے رہے تھے اور مسلمان نیشنلسٹ بھی ہندو اور سکھ کی تائید کر رہے تھے۔ "مسلمان نیشنلسٹ جماعت" کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مخلوط انتخاب کی بدولت ہندو اور مسلمان کی کشیدگی مٹ جائے گی لیکن مسلمان من حیث القوم مخلوط انتخاب کے سخت مخالف تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ "مخلوط انتخاب کے ذریعے وہ اپنی قوم کی نمائندگی ہرگز نہیں کر سکتے"۔

اِدھر کانگریس کا یہ دعوٰے تھا کہ ہندوستان کی وہ واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور کچھ تنگ نظر اور کوتاہ بین مسلمانوں کا کانگریس کا ہمنوا ہونا کانگریس کے اس دعوے کو بہت تقویت پہنچا رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں میں اس وقت ایک بڑی مقتدر ہستی ایسی بھی تھی جو بہ بانگ دہل یہ اعلان کر رہی تھی کہ کانگریس اور انگریز کے علاوہ ہندوستان میں ایک اور پارٹی بھی ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس جماعت کے مطالبات نہ کانگریس کیلئے رد کر دینا آسان ہے اور نہ انگریز کے لئے نظر انداز کر دینا ممکن ہے اس مقتدر ہستی کا نام محمد علی جناح تھا جس نے مسلم لیگ میں حیاتِ سیاسی کی ایک زبردست تڑپ پیدا کر دی تھی۔ محمد علی جناح اس حقیقت سے آشنا تھا کہ مسلمان قوتِ ایمان سے عاری ہو چکا ہے اسلئے وہ ہندو کے آگے دستِ سوال دراز کر رہا ہے۔ محمد علی جناح کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق پھر ایک بار یاد دلا دے یعنی مسلمان کسی فرقہ کا نام نہیں بلکہ ایک قوم کا نام ہے وہ قوم جس کے کارناموں سے اوراقِ تاریخ مزین ہیں۔

گاندھی جی جب دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو اس وقت وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن نے عام بدامنی کو روکنے کے لئے بہت سے آرڈیننس جاری کر رکھے تھے اور بہت سے کانگریسی لیڈر جن میں کچھ سوشلسٹ مسلمان بھی تھے جیلوں میں بند تھے۔ گاندھی جی نے واپسی پر جیسے کہ گذشتہ اوراق میں ہم بیان کر چکے ہیں کچھ سیاسی سرگرمی دکھانی چاہی تو حکومت نے انہیں بھی گرفتار کر لیا۔ ہندوؤں کی ان سیاسی سرگرمیوں سے مسلمان بالکل الگ رہے جس کی وجہ سے متعدد مقامات پر ہندو مسلم فساد بھی ہوئے اور دونوں قوموں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح نے اس کانفرنس میں بہت سرگرمی سے کام کیا۔

حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس کے سب اجلاسوں کی روئداد "وائٹ پیپر" کے نام سے شائع کر دی اور ہندوستان کے لئے مناسب دستور وضع کرنے کے لئے ایک "سیلیکٹ پارلیمنٹری کمیٹی" بنا دی۔ ۱۹۳۵ء میں گول میز کانفرنس کی سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ جب اسمبلی میں پیش ہوئی تو کانگریس نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس مرحلہ پر ہندو مسلم تعلقات پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئے۔ "کانگریس نیشنلسٹ پارٹی" اور "ہندو مہا سبھا" نے مل کر مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور جداگانہ انتخاب اور اردو زبان کے خلاف ہندوؤں کے جذبات ہر ممکن طریق سے مشتعل کئے جانے لگے۔ "اردو" کے مقابلہ میں "بھارتیہ ساہتہ سمیلن" کے نام سے ہندی زبان کی ترویج کیلئے ایک انجمن بنائی گئی۔ ہندوؤں کے ہر پلیٹ فارم

سے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا جانے لگا۔ اُردو زبان کی مخالفت نے یہاں تک زور پکڑا کہ گاندھی جی ایسے محب وطن اور صلح کل آدمی نے ساہتیہ سمیلن ناگ پور کے جلسے میں اُردو زبان کے متعلق صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا" ﴿

پنجاب میں بھی ہندو مسلم کشیدگی بہت زوروں پر تھی۔ لیکن یہاں ہندو چونکہ اقلیت میں تھا اس لئے وہ سکھوں پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی قیادت سر فضل حسین جیسے ماہر سیاست داں کے ہاتھ میں تھی۔ احرار سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی چالیں چل رہے تھے اور سر فضل حسین سے ٹکر لینے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن سیاست کے میدان میں سر فضل حسین کے مقابلہ میں احراری لیڈروں کی چالیں محض بازیٔ طفلانہ کی حقیقت رکھتی تھیں۔ اس لئے جماعت احرار کی سب چالیں ناکام رہیں۔ لیکن سر فضل حسین کا اچانک انتقال ہو گیا اور سر سکندر حیات صوبہ کے وزیر اعظم بنے اور اُنہوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے سمجھوتہ کر کے "یونینسٹ پارٹی" قائم کی۔ احراریوں کو پھر ایک بار اقتدار حاصل کرنے کے سہانے خواب نظر آنے لگے لیکن اس وقت لاہور میں "مسجد شہید گنج" کا قضیہ اچانک پیدا ہو گیا۔ مسجد شہید گنج پر مدت سے سکھ قابض تھے۔ مئی ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے اس مسجد کو گرا دینے کا فیصلہ کیا۔ مسجد کے ساتھ سکھوں کا چونکہ ایک گوردوارہ تھا اس لئے وہ گوردوارے کی توسیع کیلئے مسجد کو منہدم کرنا چاہتے تھے۔ سکھوں نے حکومت پنجاب سے

اجازت مانگی اور حکومت نے سکھوں کی درخواست منظور کرلی۔ اور یہ سب کچھ اُس وقت ہؤا۔ جب سکھوں اور احرار لیڈروں کے درمیان کچھ دوستانہ معاہدے ہو چکے تھے۔ حکومت کی اجازت اور سکھوں کے اس ناپاک ارادے سے مسلمانان لاہور میں بےحد جوش اور اضطراب پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کے کئی وفد گورنر سے ملے۔ اور معاملہ کی اہمیت بڑے معقول طریقے سے گورنر کے سامنے پیش کی۔ ان وفود میں میاں امیرالدین صاحب نے جو اپنی قومی اور ملی سرگرمیوں کے باعث مسلمانوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ (کچھ مدت بعد لاہور کارپوریشن کے پہلے میئر منتخب ہوئے) مسلمانوں کی طرف سے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ اور ایک موقع پر تو گورنر سے بھی ان کی تیز سی جھڑپ ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار کے "نیلی پوش" بھی سر پر کفن باندھ کر مسجد کے تحفظ کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن سکھوں نے حکومت کی مدد سے رات کے وقت مسجد کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کو جب اس واقعہ کا علم ہؤا۔ تو وہ جتھے بنا بنا کر مسجد کو ہو لئے۔ حکومت نے تشدد سے کام لیا۔ نہتوں پر گولیاں چلائیں۔ بہت سے مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور ہزاروں جیلوں میں بند ہو گئے۔ یہ آگ سارے پنجاب میں پھیل گئی لیکن اگر کوئی خاموش رہا تو احرار رہے یا خاکسار۔ آخر مسٹر محمد علی جناح لاہور تشریف لائے اور مسلمانوں کو آئینی طریقہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس طرح یہ آگ فرو ہوئی ÷

۱۹۳۶ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس سر وزیر حسن کی صدارت میں ہؤا اور یہ قرار پایا کہ "جدید دستور" قبول کر لیا جائے۔ گو یہ "جدید دستور" بھی نقائص سے پاک نہ تھا لیکن وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اصلاحات سے جس قدر بھی فائدہ

حاصل ہو سکے اُٹھا لیا جائے۔ اور یہ فیصلہ بھی ہؤا کہ آنے والے انتخابات میں مسلم لیگ بھی اپنے امیدوار کھڑے کرے چنانچہ مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ایک مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ اس غرض سے بنایا گیا کہ یہ بورڈ آنے والے انتخابات میں قوم کی رہنمائی کرے ؛

۱۹۳۷ء میں "جدید دستور" کے ماتحت عام انتخابات کی مہم مُلک میں شروع ہو گئی۔ اور کانگریس بڑی سرگرمی سے کام کرنے لگی اور گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں اپنے نمائندے منتخب کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اسے یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ ان سات صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم کرے۔ لیکن کانگریس اگر وزارتیں بناتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس نے آئینی طور پر "جدید دستور" قبول کر لیا ہے۔ اس لئے کانگریس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور ان سات صوبوں کے لئے گورنروں نے وزارتیں بنانے کا کام مسلم لیگ کے سپرد کر دیا۔ لیکن جب مسلم لیگ نے بھی انکار کر دیا تو حکومت نے ان صوبوں میں عارضی وزارتیں قائم کر دیں اور مسلم لیگ نے اپنی تمام کوششیں مسلمانوں کی تنظیم کے لئے وقف کر دیں ؛

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس ہؤا۔ اس اجلاس میں مسلمانوں نے "مکمل آزادی" کا پروگرام بنایا صاحبِ صدر نے اپنے عالمانہ خطبۂ صدارت میں کانگریس اور حکومت پر کڑی نکتہ چینی کی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک "مسلم ماس کنٹکٹ" کی تمام قلعی کھول کر رکھ دی۔ کانگریس کی "مسلم ماس کنٹکٹ" تحریک

کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں گو مختلف مذاہب کے لوگ آباد تو ہیں ۔ اور قومیت کے لحاظ سے بھی ایک دُوسرے سے جدا ہیں لیکن وہ سب ہندوستانی کہلائیں گے ۔ جواہرلال "مسلم ماس کنٹکٹ " تحریک کے حامیوں میں ڈاکٹر سیّد محمود اور ڈاکٹر محمد اشرف اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولوی حسین احمد مدنی سب سے پیش پیش تھے ۔ لیکن اس موقع پر عالم اسلام کے سب سے بڑے مفکر اور شاعر اعظم حضرت علامہ اقبالؒ نے وطنیت کا اسلامی فلسفہ کچھ ایسے انداز سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا کہ "مُسلم ماس کنٹکٹ " کا فتنہ بالکل دب گیا ۔ اور مسلمانوں کو اس مُصیبت سے نجات ملی ۔ اسی موقع پر حکیم الملّت حضرت علامہ اقبالؒ نے مولوی حسین احمد مدنی کے متعلق وہ اشعار ارشاد فرمائے جو ہم گذشتہ اوراق میں کہیں نقل کر چکے ہیں ؎

گو مسلمانان ہندوستان کو اپنی سیاسی اُلجھنوں سے کبھی فرصت نہ ملی تاہم وہ بیرون ہند مسلمانوں کی حمایت اور ہمدردی کے کام سے بھی کبھی غافل نہ رہے ۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس کا جو اجلاس کراچی میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوُا ۔ صاحب صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کُھلے الفاظ میں فلسطین کے عربوں کی حمایت کی ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بھی حکومت برطانیہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ۔ کہ تشدد اور بے انصافیوں کا دَور بہت دنوں تک نہیں رہ سکتا ۔ اسی طرح مسلمانوں

سے خطاب کرتے ہوئے بڑے ذمہ دار الفاظ میں انہیں یہ مشورہ دیا۔ کہ ہندوستان میں عزت اور آبرو سے رہنا ہے تو وہ اپنے آپ کو مضبوط بنائیں اور اپنی تنظیم کریں ؂

پنجاب میں مجلس احرار ابھی تک زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہی تھی۔ مسجد شہید گنج کے موقع پر احراریوں کے طرز عمل سے ملک میں اس جماعت کے خلاف نفرت پھیل چکی تھی۔ اچانک ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ میں شیعہ اور سنیوں میں تبرّہ اور مدح صحابہ کا قضیہ پیدا ہو گیا۔ اور کئی بار دونوں جماعتوں میں تصادم بھی ہوا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مجلس احرار نے "مدح صحابہ" کی تحریک جاری کر دی اور سنیان لکھنؤ کی مدد کے لئے پنجاب سے جتھے بھیجنے شروع کر دیئے۔ اس وقت صوبہ کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ کانگریس نے جب یہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتے دیکھا تو مسلم لیگ سے درخواست کی کہ وہ کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ مل کر دونوں فریقین میں صلح صفائی کرا دے۔ اس اثنا میں پنجاب سے "خاکسار" بھی اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینے کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں "خاکسار جماعت" وجود میں آئی۔ اس جماعت کا پروگرام ہر نقطہ نظر سے مسلمانوں کیلئے بہت مفید تھا۔ یہ جماعت فوجی طریق پر تنظیم اور سوشل خدمت کرتی تھی اور سیاسات سے بالکل علیحدہ رہتی تھی۔ مسلمان بڑے شوق سے اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ اس تحریک کا سارا نظام بالکل فوجی اور

اسلامی نظام تھا۔ اور اس کا واحد مقصد خدمت اسلام تھا یا مسلمانوں کی تنظیم۔ یہ تحریک ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر طبقہ کے لوگوں نے بقدر ہمت مالی مدد سے اس کی ہمت بڑھائی۔ تمام جماعت مختلف سالاروں میں منقسم تھی۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی اس تحریک کے روح رواں تھے اور اپنی جماعت میں "امیر" کہلاتے تھے ۔ ۱۹۳۹ء میں جب لکھنؤ میں تبرّہ اور مدح صحابہ کا قضیہ پیدا ہوا تو علامہ مشرقی نے مسلمانوں کی دونوں جماعتوں میں تصادم کی روک تھام کے لئے خاکساروں کو لکھنؤ بھیجا لیکن حکومت نے اس جماعت کا صوبہ میں داخلہ حکماً ممنوع قرار دے دیا۔ اس پر خاکساروں اور حکومت میں تصادم ہو گیا ؛

فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں حکومت پنجاب نے خاکساروں کی فوجی پریڈ پر پابندی لگا دی اس جھگڑے نے بھی طول کھینچا اور آخر ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں پولیس اور خاکساروں کی ایک جماعت میں خوفناک تصادم ہوا اور بہت سے خاکسار پولیس کی گولیوں سے شہید ہو گئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ مشرقی نے خاکساروں کے اس فعل سے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا اور تین سال تک جیل میں رکھا گیا ؛

جیل سے رہا ہونے کے بعد علامہ مشرقی مسلم لیگ کا حریف بن گیا لیکن جناح سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہ تھا اور حقیقت یہ ہے ۔ کہ علامہ مشرقی کی ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے خاکسار تحریک کا نام تو ہے ۔ مگر جان نہیں ۔

خاکسار تحریک کا یہ انجام بھی بہت افسوسناک ہے ۔

۱۹۳۹ء میں اتحادیوں اور جرمنی میں پھر جنگ چھڑ گئی ۔ کانگریس کو امید تھی کہ اس جنگ میں اتحادیوں کو ضرور شکست ہوگی ۔ اس لئے کانگریسی لیڈروں نے کچھ اس قسم کی چالیں چلنی شروع کر دیں جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریز ہندوستان کا نظم و نسق کانگریس کے سپرد کر دے لیکن حکومت ان چالوں اور چالبازیوں کو کب خاطر میں لاتی تھی ۔ اس پر کانگریس نے کانگریسی وزارتوں کو مارچ ۱۹۳۹ء میں مستعفی ہونے کا حکم دے دیا ۔ چنانچہ وزارتوں کے مستعفی ہونے پر ان صوبوں کا نظم و نسق گورنروں نے خود سنبھال لیا ۔ کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہر صوبے میں کیا تھا ۔ ان کے مستعفی ہونے پر مسلمانوں نے ہر جگہ بڑے جوش سے "یوم نجات" منایا ۔

کانگریسی وزارتوں نے اپنے دورِ حکومت میں مسلمانوں پر جیسے جیسے مظالم کئے اور کانگریس کے بعض ذمہ دار آدمیوں سے جیسی جیسی اخلاق سوز اور شرمناک حرکات سرزد ہوئیں ۔ یہ ایک طویل اور شرمناک داستان ہے ۔ یہ اوراق اس داستان کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ دوسرے یہ تمام قصّہ اس وقت کی سیاسی کتب میں جو مختلف حضرات نے شائع کیں شرح و بسط سے درج ہے ۔ ہم صرف یہاں واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم کا مختصر طور پر ذکر کریں گے ۔

"واردھا سکیم" اور ودیا مندر سکیم" کے متعلق مسلم لیگ کے اس اجلاس میں جو ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح کی صدارت میں پٹنہ میں ہوا مجلس استقبالیہ کے صدر جناب سید عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں فرمایا۔ کہ اس قسم کی سکیمیں مسلمان بچوں کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہونگی ۔ لیکن کانگریس نے یہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ بہار اور سی۔پی میں مسلمان بھی رہتے ہیں اور ان کے بچے بھی وہاں کے مدارس میں ہندو بچوں کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے ہیں۔ اس لئے مشترکہ تعلیم گاہوں میں ایسی فرقہ وارانہ سکیم رائج کرنا جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگے ہمسائگی اور رواداری کے بالکل خلاف ہے لیکن حکومت چونکہ ہندو کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس پر یہی مثل صادق آتی تھی کہ ع

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں!

کانگریس کی دھمکیوں کے باوجود جنگ کے دوران میں حکومت کانگریس کے مطالبہ کے سامنے نہ جھکی اور کانگریسی لیڈر حسب عادت پھر حکومت سے رُوٹھ گئے اور حکومت بھی خاموش ہو رہی ۔ یورپ کی اس لڑائی میں دنیا بھر کے مسلمان کسی نہ کسی معنوں میں اثر پذیر ہو رہے تھے ۔ اور مسلم لیگ کے پیشِ نظر عالمِ اسلام کا مستقبل تھا ۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے "لارڈ لن لتھ گو" تھے ۔ مُسلم لیگ حکومت کا ہاتھ بٹانے کو تو تیار تھی لیکن ایک غلام یا ماتحت کی صورت میں نہیں بلکہ ایک طاقت ور دوست کی صورت

سے۔ چنانچہ اس موضوع پر مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر اور وائسرائے میں کچھ عرصہ خط و کتابت ہوتی رہی اور مسلمانوں کے سیاسی مطالبات پر بحث رہی۔ اور آخر وائسرائے نے مسٹر جناح کے ایک خط کے جواب میں لکھا:-

"گورنمنٹ آف انڈیا کی خواہش پر ملک معظم کی گورنمنٹ اس بات کی پوری پوری احتیاط کر رہی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے جذبات کا پورے طور پر احترام کیا جائے۔"

لیکن مسلم لیگ کے صدر اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکے لارڈ ویول ہندوستان کے کمانڈر انچیف مقرر ہو کر آئے۔ تو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں ہندو مسلمانوں اور دیگر اقوام کی ایک مشاورتی کونسل بلائی اور مسٹر جناح کو بھی دعوت دی۔ لیکن مسٹر جناح نے شمولیت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک مسلم لیگ کے مطالبات نہ مانے جائیں اس وقت تک وہ اس قسم کی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔

لیکن انگریز وہی روزِ اوّل کی مسلم آزار پالیسی پر برابر قائم تھا۔ اور یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کانگریس کی تمام کوششیں ہندوستان میں انگریزی راج ختم کر کے رام راج قائم کرنے پر مرکوز ہیں پھر بھی کانگریس کی نازبرداریاں کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے بھی ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک نئی کروٹ لی۔ اور مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا جو اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت

میں لاہور میں منعقد ہوا - اس میں پاکستان حاصل کرنے کا اعلان کر دیا گیا ؎

یہ وہی پاکستان تھا جس کی تجویز حکیم ملّت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے قوم کے سامنے پیش کی تھی اور ایک نہایت فصیح اور بلیغ خطبہ میں مسلمانانِ ہندوستان کے دکھ درد کا علاج یہ بتایا تھا کہ پنجاب - شمال مغربی صوبہ سرحد - سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی سلطنت قائم کرنی چاہیئے - لیکن اس وقت بعض مسلمان لیڈروں نے استادِ مکرّم حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی اس تجویز کا دبی زبان میں مضحکہ بھی اُڑایا اور خود مسٹر جناح بھی کچھ تذبذب میں پڑ گئے - لیکن کچھ روز بعد جب حضرت علامہ خلد آشیانی اور مسٹر جناح میں اس موضوع پر خط و کتابت ہوئی تو مسٹر جناح کو بھی مسلمانوں کا دکھ دور کرنے کے لئے یہی سب سے بہتر نسخہ نظر آیا - لیکن چونکہ اس وقت ملک کا سیاسی منظر تیزی سے بدل رہا تھا - یہ تجویز محض ایک تجویز ہی ہو کر رہ گئی لیکن آخر وہ دن بھی آیا - جب حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی اس حکیمانہ تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے قوم کو ہوشیار کیا - اور کانگریس اور حکومت ہندوستان کو بھی للکارا - کہ حصول پاکستان کے لئے مسلمان اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے - مسلم لیگ کے اس مطالبہ پاکستان سے کانگریس کے ایوانِ ریاکاری میں بھی زلزلہ سا محسوس ہونے لگا - ہندو جانتا تھا کہ مسلمان اگر کسی مطالبہ پر ڈٹ جائے تو پھر اُس کو اس سے روکنا آسان نہیں - اس لئے ہندوستان میں " رام راج " قائم کرنے کا کانگریس جو خواب دیکھ رہی

تھی وہ خواب اب ایک سراب کی صورت اختیار کرنے لگا تھا کیونکہ ملک تقسیم ہو جانے سے ملک میں "رام راج" قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہندو لیڈر اور مہاسبھا نے اسی روز سے مسلمانوں کے خلاف ایک جنگی محاذ تیار کرنے کی خفیہ کارروائیاں شروع کر دیں لیکن مسلمان خواب خرگوش میں سوتے رہے جس کا خمیازہ انہیں پاکستان بن جانے کے بعد جس کا ذکر آگے آئے گا اُٹھانا پڑا ۔

پاکستان کے قیام سے صرف ہندوؤں کو ہی خطرہ نہیں تھا بلکہ حکومت برطانیہ کی نگاہ میں بھی پاکستان ایک خار بنکر کھٹکنے لگا تھا کیونکہ پاکستان کے قیام سے دُنیا بھر کی مسلمان حکومتیں ایک لڑی میں منسلک کی جا سکتی تھیں اور وقت پڑنے پر ایک ملک دوسرے ملک کی مدد کر سکتا تھا۔ ہندوؤں نے "مطالبہ پاکستان" کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ گو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بعض معقول طبیعت اور انصاف پسند ہندو زعمانے بھی مطالبہ پاکستان کو مسلمانوں کا ایک جائز مطالبہ تسلیم کیا۔ اور اب ہندو بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے۔ کہ اگر ہندو مسلمانوں سے رواداری برتتے۔ اور ہمسائگی کا خیال رکھتے تو شاید مسلمان ملک کی تقسیم کا سوال نہ اُٹھاتے۔ اور تو اور خود انگلستان میں کچھ ذمہ دار لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کہ اگر کانگریس اپنے دورِ حکومت (وزارتیں) میں مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھتی تو شاید پاکستان کا سوال پیدا نہ ہوتا اور وزیر ہند مسٹر ایمری نے تو اسی

خیال کا پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں بھی اظہار کر دیا - اور آخر انگریزوں نے بھی اپنے سیاسی اور ملکی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے "پاکستان" کی شاطرانہ طور پر مخالفت شروع کر دی ؛

۱۹۴۲ء میں "سر کرپس" تجاویز لے کر حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے - اس وقت یورپ میں جنگ زوروں پر تھی - اور جاپانی فوجیں بھی ہندوستان کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور کانگریس اس خیال سے خوش ہو رہی تھی - کہ جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہو رہی ہیں - اور شاید اسے بھی انگریز کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا موقع مل جائے - جس روز سر سٹیفورڈ کرپس نے سرزمین ہند پر قدم رکھا مسلمان اس روز بڑے زور شور سے "یوم پاکستان" منا رہے تھے - "سر سٹیفورڈ کرپس" نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا - اور ہر قوم کے رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا - آخر کرپس کی تجاویز شائع کر دی گئیں - اس میں حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ وعدہ بھی تھا کہ جنگ کے ختم ہونے پر ہندوستان کو "حکومت خود اختیاری" دے دی جائے گی - "کرپس کی تجویز" چونکہ کانگریس کے نقطہ نظر سے ہندوؤں کے مفید مطلب نہیں تھیں - اس لئے ہندوؤں کی تمام سیاسی جماعتوں پر کچھ اداسی سی چھا گئی - کیونکہ ان تجاویز کو اگر قبول کر لیا جاتا تو رام راج کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا ؛

یہ تجاویز برطانیہ کے شاطروں کے مغز کا نچوڑ تھا - ایک طرف تو

کانگریس کو "رام راج" کے سبز باغ دکھائے گئے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے سامنے بھی "پاکستان" کا اصول تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کا ایک مبہم سا نقشہ پیش کر دیا تھا۔ لیکن اسلامیان ہندوستان نے اپنے قائد اعظم کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے ان تجاویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے ان تجاویز کے متعلق ایک ریزولیوشن کے ذریعے اظہار ناراضگی یا اظہار انکار کیا۔ کانگریس کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان میں "رام راجیہ" قائم کرنے کے لئے اُسے آئینی طور پر اختیار دے دیا جائے۔ اور انگریز کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ کانگریس کی مخالفت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ "کرپس" کی تجاویز میں مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو بھی تقویت حاصل ہوتی تھی۔ اور کانگریس یہ مطالبہ ماننے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھی۔ دونوں قوموں کے انکار سے بیرونی دُنیا کو بھی آخر یہ تسلیم کرنا ہی پڑا۔ کہ کانگریس سارے ہندوستان کی واحد نمائندہ ہرگز نہیں اور مسلم لیگ دس کروڑ مسلمانان ہندوستان کی واحد نمائندہ ہے۔ کانگریس کو جب اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو گاندھی جی نے پھر ایک بار حکومت کو سول نافرمانی کی دھمکی دی۔ جنگ کے زمانے میں جب حکومت کو جاپان کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا بھی خوف تھا کانگریس کی یہ دھمکی ایسی ہی تھی۔ جیسے کوئی کسی کی پیٹھ میں پیچھے سے خنجر گھونپ دے ۔

اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے "سول نافرمانی" کی قرارداد پاس

کی اور حکومت نے تمام کانگریسی لیڈروں کو حراست میں لے لیا۔ ملک میں پھر ایک بار اودھم مچا۔ اور ہندوؤں نے کہیں ریل کی پٹڑیاں اکھیڑ ڈالیں۔ کہیں اسٹیشنوں کو تباہ کر دیا۔ کہیں ڈاک خانوں اور پولیس کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن انگریزوں کو نقصان پہنچانے کی بجائے جہاں بھی موقع ملا صرف مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا۔ چند روز کی ہڑبونگ کے بعد وہ ہندو لیڈر جو کسی وجہ سے گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ حکومت اور کانگریس میں صلح کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ ساتھ ہی قائداعظم کو بھی طرح طرح سے یہ یقین دلانے لگے کہ گاندھی جی مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے خلاف ہرگز نہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کو بھی کانگریس کے رہنماؤں کی رہائی کی تائید کرنی چاہیئے۔ آخر کچھ ٹک ٹک جھک جھک کے بعد کانگریسی لیڈروں کو جیلوں سے رہا کر دیا گیا اور اب پھر وہی کانگریس تھی اور وہی اُس کی چالیں تھیں۔ یعنی ع

وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ستمبر ۱۹۴۴ء میں دونوں قوموں کے رہنماؤں کی کوششوں سے مسٹر گاندھی اور قائداعظم میں سیاسی اختلافات کو سلجھانے کے لئے بمبئی میں ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ ملک کے ان دونوں عظیم المرتبت رہنماؤں میں ملاقاتیں بھی ہوئیں اور دو قوموں کے نظریئے اور قیام پاکستان کے متعلق خط و کتابت بھی ہوئی لیکن کانگریس کا نظریہ نہ بدل سکا اور ان ملاقاتوں اور خط و کتابت کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا ×

مسلم لیگ کے سامنے صرف ایک سوال تھا "حصول پاکستان"! قائداعظم

محمد علی جناح نے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی تڑپ پیدا کر دی تھی ۔ یوپی ۔ سی پی اور بہار کے مسلمان یہ جانتے ہوئے بھی کہ قیام پاکستان سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور پاکستان کے قیام کے بعد وہ بالکل ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہونگے ۔ پاکستان کا نعرہ لگا رہے تھے ۔ اور کانگریس اور حکومت اس مطالبہ کو ناکام بنانے میں مصروف تھی ۔ تاہم انگریزوں اور ہندوؤں میں کچھ انصاف پسند ایسے آدمی بھی تھے جو کھلے بندوں مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کی زبان اور قلم سے حمایت کر رہے تھے ؂

ہندو مہا سبھا کے تنگ نظر اور متعصب لیڈر ساورکر ۔ شیام پرشاد مکرجی اور اسی گروہ کے دوسرے کٹر مہا سبھائی برابر "ہندوستان ہندوؤں کا ہے" کی رٹ لگا رہے تھے اور کانگریس کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی صلح ۔ آشتی اور انصاف کے سب اصولوں کو چھپر پر رکھ کر پاکستان کی مخالفت پر ڈٹ گئے اور جب راجگوپال چاریہ نے جو کانگریس کے ایک بڑے مقتدر رہنما متصور ہوتے ہیں ۔ کانگریس کو مسلمانوں کا مطالبہ مان لینے کا مشورہ دیا ۔ تو پنڈت جواہر لعل نہرو ۔ گاندھی جی اور مسلمانوں کا دیرینہ دشمن ولبھ بھائی پٹیل غصّہ سے تلملا اُٹھے ۔ ان اوراق کے مطالعہ کرنے والے کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ولبھ بھائی پٹیل سے زیادہ متعصب ۔ تنگ نظر اور دشمن اسلام کانگریس کی تاریخ میں اور کوئی شخص پیدا نہیں ہوا ۔ الغرض جتنے ہندو رہنما تھے سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے ۔ اس وقت مُلک میں

کمیونسٹ خیال کے آدمی بھی پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر کسانوں اور مزدوروں کے ہمدرد تھے۔ اس جماعت میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ غیر مسلم جماعتوں میں سے "کمیونسٹ پارٹی" نے سب سے پہلے نظریہ پاکستان کی حمایت کی۔ اور کانگریس اور مہاسبھا نے اسی روز سے اس جماعت کی مخالفت کا فیصلہ کر لیا۔ گو بعد میں اس جماعت نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ جس کا تذکرہ موزوں مقام پر کیا جائے گا۔

پنجاب میں اس وقت یونینسٹ پارٹی برسر اقتدار تھی اور سر سکندر حیات اس پارٹی کے لیڈر تھے اور گورنمنٹ پنجاب کے وزیر اعظم بھی۔ وہ اور نہیں تو لفظی طور پر مسلم لیگ کے ہم نوا تھے۔ لیکن جب دسمبر ۱۹۴۲ء میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ان کا اچانک انتقال ہو گیا تو پارٹی کے لیڈر ملک خضر حیات ٹوانہ بنے اور وزارت عظمیٰ بھی انہی کے حصے میں آئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے انہیں دعوت دی کہ وہ غیر مشروط طور پر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لینے لگے یہ معاملہ نے طول کھینچا اور خضر حیات خاں کی ناعاقبت اندیشیوں سے پنجاب میں مسلم لیگ اور مسلم فوائد کو ایک خوفناک دھچکا لگا۔ تقسیم ملک کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کا جو کشت و خون ہوا اس کی ذمہ داری ملک خضر حیات خاں ٹوانہ پر بہت بڑی حد تک عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح مجلس احرار نے بھی کھلے بندوں "پاکستان" کی مخالفت کرنی شروع کر دی جس طرح حکیم ملت

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے مولوی حسین احمد مدنی کی اسلام فروشانہ سرگرمیوں سے بیزار ہو کر چند اشعار میں اپنی بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں صاحب نے احراریوں کی ننگِ اسلام حرکات سے جل کر کہا تھا ؎

اسلام اور ایمان اور احسان سے بیزار | اللہ کے قانون کی پہچان سے بیزار
کافر سے موالات مسلمان سے بیزار | ناموسِ پیغمبر کے نگہبان سے بیزار
احرار کہاں کے یہ ہیں اسلام کے غدار | اس پہ ہے یہ دعوے کہ ہیں اسلام کے احرار
پنجاب کے احرار۔ اسلام کے غدار!

پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی خضر وزارت کی کمزوریوں کے باعث مسلمانوں کے حقوق ہندوؤں کے مفاد پر بڑی دریا دلی سے قربان کئے جا رہے تھے۔ اور مسلم لیگ کی کوئی بات تک نہ پوچھتا تھا۔ آخر اس گتھی کے سلجھانے کو حضرت قائدِ اعظم بہ نفسِ نفیس لاہور تشریف لائے۔ اور انہوں نے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ سے مطالبہ کیا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں لیکن اس وقت وزارت پنجاب میں سر فضل حسین مرحوم کا تربیت یافتہ اور گرگ جہاندیدہ سر چھوٹو رام بھی موجود تھا۔ اور ملک خضر حیات خاں اسی کے اشارۂ ابرو پر چلتے تھے۔ چنانچہ سر چھوٹو رام کے مشورے سے ملک صاحب نے یہی فیصلہ کیا کہ صوبائی معاملات میں مسلم لیگ کی مداخلت وہ کسی طرح برداشت

نہیں کر سکتے۔ ادھر نئے انتخابات کی مہم جاری ہونے والی تھی اور یونینسٹ پارٹی اپنے تمام حربوں کے ساتھ مسلم لیگ کو انتخابات میں نیچا دکھانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہونے کا اعلان ہوا۔ لیگ کا اجلاس "منٹو پارک" میں ہونا تھا۔ لیکن ملک خضر حیات خاں ٹوانہ وزیر اعظم کے مشورہ سے حکومت نے مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے "منٹو پارک" دینے سے انکار کر دیا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ پارک لوگوں کی تفریح کی جگہ ہے لیگ کے اجلاس کے دوران میں ایک تو پارک کے سر سبز میدان خراب ہوں گے اور دوسرے تفریح کرنے والے اتنے روز تفریح نہ کر سکیں گے۔

اب مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے موزوں جگہ کا سوال تھا۔ آخر میاں امیر الدین صاحب نے دریائے چھوٹا راوی کے پار اپنی وسیع اراضیات لیگ کے اجلاس کے لئے پیش کر دیں اور ہزاروں روپوں کی ایستادہ فصل کا نقصان برداشت کر کے لیگ کے اجلاس کے لئے زمین صاف کروا دی۔ منٹو پارک سے میاں صاحب کی پیش کردہ جگہ صرف دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی چنانچہ لیگ کے اجلاس کے لئے بڑے جوش سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لیکن قائد اعظم کی اچانک علالت کی وجہ سے لیگ کا اجلاس تو ملتوی ہو گیا۔ لیکن میاں امیر الدین کا یہ قومی جذبہ خضر وزارت کی آنکھوں میں ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتا رہا۔

مسلمانانِ پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف نفرت اور غصّے کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ لیکن پنجاب کے گورنر "سر گلینسی" کو تو مسلمانوں سے اس قدر بَیر تھا۔ کہ وہ خضر وزارت کے خلاف کچھ سُننے کو تیار ہی نہ تھے۔ مسلم لیگ نے کئی بار وزارت بنانے کی کوشش کی اور گو ایوان میں بھی مسلم لیگ کو اکثریت حاصل تھی لیکن سر گلینسی مسلم لیگ کو وزارت بنانے کا موقع دینے کو کبھی تیار نہ ہو سکے۔ اس وقت انتخابات کا وقت قریب آگیا تھا اور حکومت کی مکمل مشینری مسلم لیگ کے نمائندوں کو زک دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اور ہر جائز اور ناجائز طریق سے رائے دینے والوں کو یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے ترغیب بھی دے رہی تھی اور دھمکیاں بھی۔ اور یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ انتخابات کے افسروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی خفیف سے خفیف اعتراض پر بھی نامنظور کر دیں۔ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں بیرون شہر کے لئے میاں عبدالعزیز بارایٹ لاء نے اور اندرونی حلقہ کی طرف سے مسلمانانِ لاہور کے ہر دلعزیز رکن میاں امیرالدین صاحب نے مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے لئے درخواستیں دیں۔ لیکن ان دونوں حضرات کے نامزدگی کے کاغذات نہایت مضحکہ خیز طور پر نامنظور کر دیئے گئے اور یونینسٹ وزارت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن میاں امیرالدین صاحب کی کوششوں سے لاہور کی دونوں سیٹوں کے لئے اسی روز مسلم لیگ کے نئے نمائندے کھڑے کر دیئے گئے اور لاہور کے انتخابات میں یونینسٹ وزارت کے امیدواروں نے بڑی شرمناک زک اُٹھائی ٭

آخر ۲۳ فروری ۱۹۴۶ء کو پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا نتیجہ شائع کر دیا گیا۔ پنجاب اسمبلی کی کل ۱۷۵ نشستیں تھیں۔ ان میں مسلمانوں کے لئے صرف ۸۶ نشستیں تھیں۔ ان میں سے ۷۵ نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ اور یونینسٹ وزارت کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ کانگریس نے بھی مسلم لیگ کی نشستوں پر قبضہ کرنے کو پانی کی طرح روپیہ بہا دیا۔ لیکن مایوسی اور نامرادی کے سوا ہندوؤں کو کچھ حاصل نہ ہُوا۔ لیکن سر گلینسی کی ضد کی وجہ سے مسلم لیگ وزارت پھر بھی نہ بن سکی ؎

اس دوران میں مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کی کوششیں بھی برابر جاری رہیں۔ نئے نئے فارمولے تیار ہوئے۔ نئی نئی سکیمیں وجود میں آئیں۔ لیکن کانگریس دو قوموں کا نظریہ تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہو سکی ؎

---

۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو فیلڈ مارشل لارڈ ویول وائسرائے ہندوستان نے جو ملک معظم کی حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے انگلستان گئے ہوئے تھے واپس آ کر کانگریس اور مسلم لیگ کے سامنے کچھ تجاویز پیش کیں جو "ویول پیشکش" (ویول پلان) کے نام سے مشہور ہیں جس میں چند یہ تھیں۔

مجوزہ جدید مجلس عاملہ میں مُلک کے اہم فرقوں کو نمائندگی کا حق دیا جائیگا ؎

اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی مساوی تعداد میں ہو گی ؎

امور خارجہ کے محکمہ پر کسی ہندوستانی کا تقرر ہو گا ؎

وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے سوا مُلک کا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو گا ؎

اس کے بعد وائسرائے اور ملک کے سیاسی رہنماؤں میں کچھ روز خط و کتابت ہوتی رہی اور آخر ۲۵ جون ۱۹۴۵ء میں شملہ میں وائسرائے لاج میں ملک کے لیڈروں کی ایک کانفرنس شروع ہوئی۔ جو شملہ کانفرنس کے نام سے مشہور ہے ممکن تھا کہ کوئی فیصلہ ہو جاتا لیکن کانگریس کی تنگ نظری نے پھر بنا بنایا کام بگاڑ دیا اور وائسرائے کی مجلس شوریٰ (ایگزیکٹو کونسل) میں ہندو اور مسلمان ممبروں کی تعداد متعین کرنے پر مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلاف پیدا ہو گیا ؛

مسٹر جناح کا یہ مطالبہ تھا کہ وائسرائے کی مجلس شوریٰ میں جو پانچ مسلمان ممبر لیئے جانے کا فیصلہ ہوا ہے یہ پانچوں ممبر مسلم لیگ منتخب کرے گی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مسلم لیگ ہی واحد نمائندہ ہے لیکن کانگریس نے یہ حجت پیش کر دی کہ اگر کونسل میں پانچ مسلمان ممبر لئے جائیں تو تین تو مسلم لیگ کے ہوں اور دو غیر لیگی مسلمان ہوں۔ جو کانگریس منتخب کرے۔ اس تجویز میں پنجاب کے وزیر اعظم ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کانگریس کے زبردست حامی تھے۔

ادھر قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی لیکن آخر ہوا وہی جس کا خدشہ تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے کانفرنس کے ناکام رہنے کا اعلان کر دیا اور قائد اعظم حکومت سے یہ مطالبہ کرنے لگے۔ کہ ملک میں نئے انتخابات کرائے جائیں۔ اس وقت انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار تھی۔ اس لیئے وائسرائے ہند لارڈ ویول نئی وزارت سے مشورہ کرنے پھر ایک بار انگلستان گئے اور ستمبر ۱۹۴۵ء میں واپس آ کر

یہ اعلان کیا کہ "مرکزی اور صوبائی" مجالس آئین ساز کے انتخابات جلد کرائے جائیں گے۔ اس کے بعد ہندوستان کو آزادی دینے کے مسئلہ پر غور کیا جائے گا ✧

مسلم لیگ اور کانگریس میں نئے انتخابات لڑنے کی بڑے جوش کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آخر نئے انتخابات کا حکومت نے اعلان کر دیا۔ مرکزی اسمبلی میں ۳۰ مسلم نشستیں تھیں۔ ان نشستوں کے لئے کانگریس جمیعتہ العلماء۔ احرار۔ خاکسار اور مسلم مجلس نے بھی اپنے نمائندے مسلم لیگ کے مقابلہ میں کھڑے کئے۔ لیکن مسلم لیگ نے پوری تیس نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ اور مخالفین منہ دیکھتے رہ گئے۔ مسلم لیگ کی اس شاندار فتح کی مثال تاریخ عالم میں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی ✧

صوبائی انتخابات میں بھی ہر جگہ مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ خصوصیت سے پنجاب میں۔ پنجاب اسمبلی میں کل ۱۷۵ نشستیں ہیں۔ ان میں سے ۸۶ مسلمانوں کے لئے وقف ہیں۔ مسلم لیگ نے ان ۸۶ نشستوں میں سے ۷۹ پر قبضہ کر لیا۔ اور خضر حیات خاں ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی صرف ۵ نشستیں حاصل کر سکی۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے پھر ایک بار پنجاب میں مسلم لیگ وزارت مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن گورنر نے پھر بھی کچھ توجہ نہ کی اور صوبہ میں غیر مسلم لیگی وزارت قائم ہو گئی ✧

بنگال میں بھی انتخابات میں کانگریس کو شکست ہوئی۔ بنگال اسمبلی میں کُل ۱۱۹ نشستیں ہیں۔ ۱۱۹ میں سے ۱۱۳ پر مسلم لیگ نے قبضہ کر لیا۔ یو۔پی میں مسلمانوں کے لئے ۶۶ نشستیں تھیں مسلم لیگ ۵۴ پر قابض ہو گئی۔ بہار میں ۴۰ مسلم نشستوں میں سے ۳۶ پر مسلمان قابض ہو گئے۔ مدراس میں مسلمانوں کے لئے کل ۲۹ نشستیں تھیں مسلمان ۲۹ نشستوں پر قابض ہو گئے۔ اڑیسہ میں بھی سو فی صدی کامیابی ہوئی اور بمبئی میں ۳۰ مسلمانوں کی نشستوں پر بھی مسلم لیگ نے قبضہ جما لیا۔ کانگریس نے انتخابات پر مسلم لیگ کو چیلنج دیا تھا۔ مسلم لیگ نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔ اور آخر مسلم لیگ نے انتخابات کی جنگ میں کانگریس کو ایسی عبرتناک شکست دی کہ یورپ کے اخبارات میں بھی کئی روز یہ تذکرے ہوتے رہے ؎

---

۲۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کیلئے ایک وفد ہندوستان بھیجا جو "وزارتی مشن" کے نام سے مشہور ہے اس وفد کے صرف تین ممبر تھے۔ ایک تو وہی سر کرپس جو پہلے ناکام ہو کر واپس چلے گئے تھے۔ دوسرے لارڈ پیتھک لارنس جو وزیر ہند بھی تھے اور تیسرے رکن مسٹر البگزینڈر تھے۔ یہ وزارتی مشن وزیر اعظم حکومت برطانیہ مسٹر اٹیلی نے محض اسلئے ہندوستان بھیجا تھا کہ ہندوستان کو آزادی دینے میں مدد دی جاسکے۔ وفد نے دہلی پہنچتے ہی سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات شروع کر دیا۔ کچھ روز وفد نے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ پھر ایک لمبا چوڑا اعلان شائع

کیا۔گو"پاکستان" کا اصول ناقابل عمل بنایا گیا تھا تاہم کچھ باتیں ایسی بھی تھیں۔جو مسلمانوں کیلئے حوصلہ افزا تھیں۔تاہم مسلمانوں کو بہت مایوسی ہوئی اور ہندوؤں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔اس اعلان کے شائع ہونے کے بعد وزیرِ ہند۔وائسرائے اور کمانڈر انچیف کی طرف سے باشندگان ہندوستان کے نام ایک بیان جاری کیا گیا جس میں یہ اُمید ظاہر کی گئی کہ وزارتی کمیشن کی تجاویز قبول کر لی جائینگی۔مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے لیگ کے پلیٹ فارم سے حکومت اور کانگریس کو للکار کر کہہ دیا۔

"میں پھر ایک بار اعلان کرتا ہوں کہ تاخیر سے نہ تو حکومت کو کوئی فائدہ پہنچیگا نہ کانگریس کو۔اگر ان کو آزادی عزیز ہے۔اگر انہیں ہندوستان کی آزادی مرغوب ہے۔اگر وہ آزاد ہونا چاہتے ہیں تو جتنی جلدی یہ حقیقت سمجھ جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔کہ آزادی کا نزدیک ترین راستہ صرف پاکستان ہے۔تم چاہے اسے قبول کرو یا نہ کرو۔ہم پاکستان لے کر رہیں گے" ٭

قائداعظم محمد علی جناح نے وزارتی مشن کا فیصلہ مسلم لیگ کے سامنے پیش کر دیا۔اور گو وزارتی مشن نے صحیح طور پر"پاکستان"کو تسلیم نہیں کیا تھا تاہم مسلمانوں کو اُمید تھی کہ وزارتی مشن کی تجاویز کے مطابق وہ دس سال کے عرصہ میں اتنے مضبوط ہو جائینگے کہ آج جب"پاکستان"کی"رُوح"کو تسلیم کیا جا رہا ہے تو وہ دس سال تک اسے جسم بھی عطا کر سکیں گے۔مسلم لیگ نے قائداعظم کی رہبری میں وزارتی کمیشن کی تجاویز کو منظور کر لیا اور دُنیا کے سیاست دانوں نے قائداعظم کی فراست۔تدبّر

اور سیاست کی دل کھول کر داد دی اور کانگریس کی تنگ نظری پر کڑی نکتہ چینی کی۔ لیگ کے فیصلے پر ہندوؤں کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا ۔

اس اعلان کے بعد حکومت نے عارضی حکومت کے قیام کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ اور ایگزیکٹو کونسل میں کانگریس اور لیگ کیلئے پانچ پانچ نشستیں سکھوں اور عیسائیوں کیلئے دو کا جب اعلان کیا تو کانگریس نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ کانگریس ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ اور کانگریسی نمائندوں کی مساوات کا اصول کبھی تسلیم نہیں کر سکتی لیکن حکومت نے ایگزیکٹو کونسل کیلئے پانچ مسلمان ۔پانچ ہندو۔ ایک اچھوت۔ ایک سکھ۔ ایک پارسی اور ایک ہندوستانی عیسائی لینے کا فیصلہ کیا اور عارضی حکومت کی تشکیل کے لئے دعوت نامے بھیج دئیے گو حکومت نے اپنے پہلے فارمولا سے انحراف کیا تھا لیکن قائداعظم نے مصلحتاً عارضی حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا لیکن کانگریس نے پھر ایک شوشہ چھوڑا اور پانچ مسلمانوں میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمان کا تقاضا شروع کر دیا۔ اب آئین کے مطابق ملک میں عارضی حکومت قائم کرنے کا حق مسلم لیگ کو پہنچتا تھا کیونکہ کانگریس نے صرف طویل میعاد کی حکومت میں شامل ہونا منظور کیا تھا لیکن وائسرائے نے پھر مسلمانوں سے بے انصافی برتی یعنی مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے ایک ایسی عارضی حکومت بنا دی جس میں صرف حکومت کے اپنے نمائندے لئے گئے تھے ۔

قائداعظم نے وزارتی مشن کی بدعہدی اور کانگریس کی فرقہ وارانہ ذہنیت سے مایوس ہو کر لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ لیگ کونسل نے دو بہت

اہم ریزولیوشن پاس کئے۔ ایک یہ کہ لیگ وزارتی مشن کی تجاویز کو نامنظور کرتی ہے۔ دوسرے ریزولیوشن میں مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت کی بدعہدی کے خلاف احتجاج کے طور پر مسلمان سرکاری خطابات واپس کردیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسی روز سے اپنے سرکاری خطابات اور اعزازات واپس کرنے شروع کر دیئے اور حصول پاکستان کے لئے جدوجہد شروع کردی :

جب مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی تجاویز تسلیم نہ کرنے کا اعلان کیا تو اس کے کچھ روز بعد کانگریس نے عبوری حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا۔ اور حکومت سنبھالتے ہی تمام ذمہ دار عہدوں پر قبضہ کر لیا۔ گو کچھ روز بعد مسلم لیگ بھی عبوری حکومت میں شامل ہو گئی لیکن ملک میں فتنہ و فساد کی آگ برابر پھیلتی گئی۔ ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ آخر حکومت برطانیہ نے لارڈ ویول کو واپس بلا لیا اور ان کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ اور اپنے عہدے کا حلف لیتے ہی ملک کی سیاسی گتھی سلجھانے میں مصروف ہو گئے اور پھر ایک بار حکومت اور کانگریس اور مسلم لیگ میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان منظور کر لیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ بنگال اور پنجاب کو بغیر تقسیم کے پاکستان میں شامل کر دیا جائے لیکن حکومت برطانیہ کے نزدیک کانگریس کو مطمئن کرنے کیلئے پنجاب اور بنگال کی تقسیم ضروری تھی اور ۳ جون کو تقسیم پنجاب اور بنگال کا اعلان کر دیا گیا۔ اور حد بندی کیلئے سر ریڈ کلف کی صدارت میں ایک بونڈری کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ صوبہ سلہٹ۔ بلوچستان

اور شمال مغربی سرحدی صوبہ تو اس کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان تینوں صوبوں میں استصواب رائے سے یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتے ہیں ؎

کانگریس نے استصواب رائے جیتنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا۔ ناجائز سے ناجائز طریق استعمال کئے لیکن تینوں صوبوں میں مسلم لیگ کے مقابلہ میں شکست فاش کھائی۔ اور وائسرائے نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ تینوں صوبے پاکستان میں شامل ہونگے ؎

"پنجاب" شاید تقسیم نہ ہوتا لیکن کانگریس نے سکھوں کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور سکھ لیڈروں نے اونگی بونگی بولیاں بولنی شروع کر دیں۔ انگریز کا میلان طبع بھی سکھوں ہی کی طرف صاف نظر آرہا تھا ؎

پنجاب میں خضری وزارت کے ختم ہوتے ہی سارے صوبے میں فرقہ دارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے سامنے نیام سے تلوار نکال کر اسے بوسہ دیا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک سکھ اپنے حقوق نہ منوا لینگے۔ آرام سے نہیں بیٹھیں گے ؎

باونڈری کمیشن کا کام شروع ہو چکا تھا۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں نظم و نسق قائم رکھنے کیلئے باونڈری فورس کے نام سے کچھ فوجی دستے بھی متعین کر دیئے گئے۔ آخر ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو باونڈری کمیشن نے اپنے یک طرفہ فیصلہ کا اعلان کر دیا اور مسلمانوں سے جو ممکن سے ممکن بے انصافی ہو سکتی تھی کر دی گئی۔ سر ریڈ کلف کے اس غیر منصفانہ فیصلہ پر دنیا ورطۂ حیرت میں آ گئی۔ اور

مسلمانوں پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ پنجاب کو مشرقی اور مغربی پنجاب میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ تمام شہر اور آبادیاں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت تھی کانگریس کے حوالے کر دیئے گئے۔ فیصلے کا اعلان ہوتے ہی مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا لیکن بنگال کی تقسیم پر کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا نہ ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان سے ڈرتا تھا اور وہاں اسے سکھوں کی مدد حاصل نہ تھی ؎

انگریزوں کی بے انصافی اور بد دیانتی اور کانگریس کی سازباز سے مسلمانوں پر مشرقی پنجاب میں جو مظالم ہوئے یہ حال کا واقعہ ہے اور ہر کہہ و مہ اس سے واقف ہے[1]۔ تاہم حکومت مغربی پنجاب کا ایک بیان جو روزنامہ "غازی" ۱۷؍اپریل ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا اس جگہ نقل کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ سکھوں اور کانگریس نے مسلمانوں کو قتل و غارت کرنے کی کیسی کیسی ناپاک سکیمیں تیار کی تھیں۔ حکومت مغربی پنجاب کا بیان ہے کہ "راشٹریہ سیوک سنگھ" نے مسلمانوں کے قتل عام کی جو سازش کی تھی اس میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم ڈاکٹر گوپی چند بھارگو۔ ماسٹر تارا سنگھ، بخشی سر ٹیک چند، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور رائے بہادر بدری داس بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اکالیوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ میں ربط و ضبط اور زیادہ بڑھ گیا۔ رائے بہادر بدری داس اور بخشی سر ٹیک چند نے اکالی لیڈر ماسٹر

---

[1] سکھوں کے مظالم کی داستان کے چند واقعات "رقص ابلیس" میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہر مسلمان کو یہ کتاب پڑھنی چاہیئے ؎

تارا سنگھ کو یقین دلایا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار روکنے میں راشٹریہ سیوک سنگھ سکھوں کی مدد کریگا۔ چنانچہ ماسٹر تارا سنگھ نے "اکالی سیوا دل" کے نام ہدایات جاری کیں کہ آئندہ "راشٹریہ سیوک سنگھ" اور "اکالی سیوا دل" ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔

۱۹۴۶ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے ناظم اعلیٰ مادھو راؤ گولکر نے صوبہ بھر کا وسیع دورہ کیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں سیوک سنگھ کے کچھ رکن تحفظ امن عامہ کی دفعہ ۲۱ کے ماتحت گرفتار کر لئے گئے۔ ان والنٹیروں کے قانونی دفاع کے لئے مقتدر ہندوؤں نے چندہ دیا جن میں رائے بہادر رجا نکی داس کا نام قابل ذکر ہے۔ رائے بہادر درگا داس اور مسٹر لیدھ راج بھلہ مینجنگ ڈائرکٹر پنجاب نیشنل بنک بھی اس سازش میں شامل تھے۔

رائے بہادر بدری داس جو ایک مشہور وکیل تھے راشٹریہ سیوک سنگھ کے زیر سماعت ملزموں کی پیروی پر مقرر ہوئے اور رائے بہادر مکند لال پوری اور رائے صاحب بخشی بھگت رام ان کے قانونی معاون اور مددگار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے اختتام تک تمام پنجاب میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی بنیادیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں اور اس کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی اور اب اس نے ایک عسکری نوعیت اختیار کر لی تھی۔ اس سنگھ کا مقصد مسلمانوں سے لڑنا اور ہندوستان میں پرانی ہندو تہذیب کی حفاظت کرنا تھا۔ سنگھ کی تنظیم میں کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماہرین قانون حضرات بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۷ء میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی تنظیم کا کام مکمل ہو چکا تھا اور انہیں یہ امید ہونے لگی تھی کہ وہ آسانی کے ساتھ مسلمانوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ لاہور کے مقامی کمانڈر دھرم ویر نے سنگھ کے ممبروں کے نام ہدایات جاری کیں کہ وہ وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیں اور انہیں اشتعال دلائیں

اور پاکستان کے خلاف نعرے لگائیں ؎

رائے بہادر بدری داس نے جو سنگھ کے بڑے سرپرست تھے۔ ہندو اخبارات کے ایڈیٹروں کو بلایا اور انہیں سنگھ کی طرف سے مسلم لیگ کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کو کہا۔ ۴ فروری ۱۹۴۷ء کو راشٹریہ سیوک سنگھ کا ایک جلسہ ہوا جس میں مہتہ اوم پرکاش اور ڈاکٹر پریم ناتھ نے سنگ کے ممبروں کو تلقین کی کہ وہ یہ کبھی نہ بھولیں۔ کہ مسلمان ان کے دشمن ہیں اور ان سے لڑنے کے لئے ہندو اور سکھ تیار رہیں۔ اس جلسہ میں ہر ممبر کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے پاس تلوار رکھے اور مسلمانوں پر تیزاب پھینکنے کا طریقہ سیکھے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں جو فسادات ہوئے راشٹریہ سیوک سنگھ کے پچاس ممبروں کا ایک جتھہ بنایا گیا۔ اس جتھے کا نام "خنجر زن" رکھا گیا۔ اُنہیں ہدایت دی گئی کہ جہاں موقع ملے مسلمانوں کو قتل کریں۔ راجپوتانہ کی ریاستوں کشمیر اور ریاست پٹیالہ سے اسلحہ پہلے سے منگوا لیا گیا تھا۔ پنجاب میں بھی سنگھ کے ممبروں کو ہتھیار جمع کرنے کی تاکید کی گئی۔ اب "راشٹریہ سیوک سنگھ" اور "اکالی دَل" یعنی اکالی فوج میں گہرا تعلق پیدا ہوگیا۔ اور وہ اس مقصد کے زیرِ نظر کہ پنجاب میں مسلمانوں کو قتل کر کے ان کی اکثریت مٹا دیں اور اس طرح پاکستان نہ بننے دیں۔ ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے لگے۔ ترنتارن۔ گورداسپور۔ بٹالہ۔ لائلپور، جگراؤں وغیرہ میں اکالی فوج اور سنگھ نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ اپریل میں دونوں کی سرگرمیاں مشرقی اور وسطی پنجاب میں بہت شدت پکڑ گئیں۔ مندروں اور گوردواروں میں سنگھ اور اکالی دَل کے جلسے ہر روز ہوتے تھے اور یہاں ممبروں کو خفیہ طور پر ہتھیار چلانا سکھایا جاتا تھا۔ اس کام کے لئے یو پی اور سی پی سے

بھی اس فن کے ماہر بلوائے گئے ۔ مئی ۱۹۴۷ء میں یہ کوئی راز نہ رہا کہ پنجاب میں جو قتل و غارت اور آتشزدگی ہوئی ہے اس کی ذمہ دار راشٹریہ سیوک سنگھ ہے ۔ سنگھ کے ممبر اپنے مندروں اور شوالوں میں بم تیار کر رہے تھے ۔ لاہور کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ ایک افسر کے ماتحت کر دیا گیا اور کافی تعداد میں اسلحہ تقسیم کر دیئے گئے ۔ تاکہ ایک مقررہ وقت پر لاہور کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جائے اور انہیں بیخبری میں قتل کیا جائے ۔"

یہ تو رہا حکومت کا بیان ۔ انڈین یونین کے ہوم ممبر پٹیل نے رام باغ امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

" اگر ہندو اور سکھ جنگ کے متمنی ہیں تو انہیں مقام اور وقت اور ذرائع کا جائزہ لینا چاہیئے ۔ لیکن اس وقت جنگ صحیح نہیں کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس طرح مغربی پنجاب میں کوئی ہندو یا سکھ نہیں رہ سکے گا ۔ اگر موجودہ پاگل پن جاری رہا تو ہمارے پناہ گزین ایک سال میں بھی پاکستان سے نہ نکالے جا سکیں گے ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائی یہاں پہنچ جائیں تو تین ماہ تک پاکستان سے عارضی صلح کر لی جائے اگر پاکستان جنگ کا متمنی ہے تو مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ اپنی بہادری کے جوہر دکھائینگے ۔ مسٹر گاندھی عدم تشدد کے قائل ہیں ۔ لیکن ہم متفق نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ اگر تلوار کو صحیح طریق پر استعمال کیا جائے تو اس سے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں "

اس بیان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کانگریس ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں

کے قتل کی ترغیب دے رہی تھی۔ اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے ایک بیان اجیت اخبار میں شائع کرایا:-

"سنہ ۱۹۴۰ء میں جب دوسری جنگ یورپ کے دوران میں فرانس شکست پر شکست کھا رہا تھا۔ ہندوستان کے حالات بھی تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ پنجاب میں سکھ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر ممکن طریق سے اسلحہ اور گولہ بارود جمع کر رہے تھے۔ ریاست بیکانیر اور صوبہ سرحد سے سکھوں کو چوری چھپے اسلحہ پہنچ رہے تھے اور میں بھی حتی المقدور سکھوں کو یہی تلقین کر رہا تھا کہ جیسے بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ملے۔ گولی بارود جمع کرو۔ جہاں تک سکھوں کا تعلق ہے ہم اکالیوں نے دوسروں سے بہت زیادہ مقدار میں سامان جنگ فراہم کیا تھا تاہم سکھوں کو اگر کوئی خدشہ یا خوف تھا تو صرف یہ تھا کہ انگریز کہیں ہندوستان سے اچانک نہ چلے جائیں اور سکھ لیڈروں میں اس موضوع پر اکثر بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی چنانچہ ہم نے پنجاب میں مختلف مقامات پر سکھوں کے منظم اور مسلح جتھوں کے ہیڈ کوارٹر بھی قائم کر دیئے تھے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہم امرتسر پر آسانی سے قبضہ کر لیں گے۔ لاہور کے متعلق یہ تجویز قرار پائی کہ سکھوں کے مسلح جتھے مختلف سمتوں سے لاہور پر حملہ کریں۔ ہمارے پاس رائفلوں کی بہت کمی تھی۔ لیکن ہمیں امید تھی کہ ہم پولیس کی چوکیوں پر حملہ کر کے رائفلیں حاصل کر سکیں گے۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سکھ بہت مدت سے مسلمانوں کے خلاف ایک منظم محاذ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کتنا تعجب ہے کہ مسلمان ان حالات سے بالکل بےخبر تھے۔ سکھ تو پنجاب پر حکومت کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور پنجاب کے مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈر صرف وزارت بنانے کی تگ و دو میں وقت ضائع کر رہے تھے ؛

پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی سکھوں نے جو سکیم تیار کی تھی۔ پاکستان ٹائمز کے ۱۶ اپریل ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں شرح و بسط کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ ایک سٹاف رپورٹر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی سکیم یہ تھی کہ مسلمانوں کا ہر جگہ قتل عام کیا جائے اور قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو قتل کر دیا جائے۔ یہ اکالی لیڈر تارا سنگھ کی سکیم تھی۔ پنجاب گورنمنٹ نے اپنے ایک پمفلٹ میں جس کا عنوان "سکھوں کے منصوبے" ہے۔ اس سازش کا کچھ حال اس طرح بیان کیا ہے :-

"سکھوں کی سکیم یہ تھی کہ وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو قتل کیا جائے اور ان کی آبادیاں جلا دی جائیں اور مشرقی اور مغربی پنجاب کی سرحد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے ؛

اس سازش کے کرتا دھرتا تین سکھ لیڈر تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ۔ گیانی کرتار سنگھ اور جتھے دار اودھم سنگھ ناگوکی۔ پروگرام یہ تھا۔ کہ کافی تعداد میں روپیہ فراہم کیا جائے۔ اسلحہ خود بھی تیار کئے جائیں اور باہر سے بھی منگوائے جائیں۔ اکالی فوج اور شہیدی جتھہ میں زیادہ

سے زیادہ سکھوں کو شامل ہونے کی ترغیب دی جائے اور تیار کردہ سکیم کے مطابق ہر جگہ مسلمانوں کو قتل کیا جائے۔ ہر فرقہ کے سکھ تعلیم یافتہ بھی اور ان پڑھ بھی سکھوں کے سیاسی اور مذہبی رہنما بھی۔ طالب علم بھی اور آئی۔ این۔ اے کے بیکار سپاہی بھی اور کسان بھی اس سکیم میں شامل تھے۔ والنیٹروں کو فوجی تربیت دینے کا بھی وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا پنجاب کی سکھ ریاستیں بھی عملی طور پر اس سکیم میں شامل تھیں اور ہندوؤں کا متعصب فرقہ بھی مددگار تھا۔ ابتدا یوں ہوئی کہ جنوری ۱۹۴۷ء میں سکھ لیڈروں نے "پاکستان" کے خلاف بڑے بڑے جلسوں میں زہر اگلنا اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ پھر سردار بلدیو سنگھ۔ ماسٹر تارا سنگھ۔ سردار سورن سنگھ نے راشٹریہ سیوک سنگھ سے سمجھوتہ کر کے امرتسر میں ایک جلسہ کیا اور مشرقی پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے ایک "ہندو سکھ اسٹیٹ" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساتھ ہی ایک زبردست اکالی فوج تیار کرنے کی سکیم تیار کی گئی۔ یہ اکالی فوج ماسٹر تارا سنگھ کے نقطہ نظر سے مسلم لیگ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تھی۔ اور من حیث القوم سب سکھوں کو لڑائی کیلئے تیار رہنے کی دعوت دی گئی۔ یہ واقعات اُس وقت کے ہیں جب پنجاب مسلم لیگ "ملی جلی وزارت" کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی ⁂

مارچ میں چیف سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں تمام سکھ اور پنجاب کی سکھ ریاستیں اس سکیم میں شامل ہو چکی تھیں۔ اور سکھ لیڈر اپنی قوم میں اسلحہ تقسیم کر رہے تھے اور اپنی آتش زبانی سے مسلمانوں کے خلاف سکھوں میں نفرت کے جذبات پیدا کر رہے تھے ؛

۸ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے قوم کے نام ایک پیغام جاری کیا - "مرجاؤ یا زندہ رہو" اور ساتھ ہی پاکستان کے خلاف ہندو سکھ متحدہ محاذ کا اعلان کر دیا۔ اس کیلئے ایک کونسل آف ایکشن بھی مقرر کی گئی۔ ماسٹر تارا سنگھ اس کونسل آف ایکشن کا ڈکٹیٹر مقرر ہوا۔ اور گیانی کرتار سنگھ۔ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور کولیشن وزارت کے تین اور ہندو اور سکھ رکن منتخب ہوئے ؛

۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو ۲۰۸ سکھوں نے اکال تخت کے سامنے "مرنے کی قسم" اُٹھائی اور انہیں "شہیدی جتھہ" کا خطاب دیا گیا۔ مندروں۔ گوردواروں اور ایسے ہی اور مذہبی مقامات میں اسلحہ اور بم بنانے کے کارخانے قائم کئے گئے اور پچاس لاکھ روپے سے زیادہ رقم فراہم کر لی گئی ؛

مئی میں سکھوں کو یہ خدشہ ہونے لگا کہ پنجاب کی تقسیم جو حکومت کے مدنظر ہے اس سے سکھوں کے مفاد کو بہت نقصان پہنچیگا۔ چنانچہ ۱۵ مئی کو شیخوپورہ میں ماسٹر تارا سنگھ نے گوجرانوالہ۔ سیالکوٹ۔ منٹگمری اور لائل پور کے سرکردہ سکھوں کی مجلس مشاورت بلائی اور انہیں

سکھ ہائی کمانڈ کے ماتحت ان پانچ اضلاع میں پاکستان کے خلاف محاذ قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ جب ۳ر جون کو تقسیم پنجاب کا اعلان ہؤا تو سکھوں میں بہت جوش پھیل گیا اور ماسٹر تارا سنگھ نے گورمکھی میں سکھوں کے نام ایک اپیل شائع کی اور ان سے کہا گیا کہ چونکہ ان کے مقدس مقامات پاکستان میں شامل کئے جانے کی تجویز ہے اسلئے سکھ ان کی حفاظت کیلئے تیار ہو جائیں اور پاکستان کے خلاف جنگ لڑنے کیلئے کم از کم دس لاکھ "شہیدی جتھہ" میں شامل ہو جائیں۔ اس طرح جولائی میں بھی ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریاں کرتے رہے اور آخر اگست میں ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔"

یہ سب کچھ تو ہؤا لیکن "پاکستان" پھر بھی بن گیا اور جس طرح مسلمانوں کی قربانیوں کا چار دانگ عالم میں چرچا ہؤا۔ اسی طرح دُنیا نے سکھوں کے مظالم اور کانگریس کی تنگ نظری پر بھی نفرت کا اظہار کیا سکھوں نے مشرقی پنجاب میں سے چُن چُن کر مسلمانوں کو نکال دیا۔ لاکھوں مسلمان شہید ہو گئے۔ ہزاروں دختران اسلام سکھ پکڑ کر لے گئے لیکن کانگریس کا دِل پھر بھی ٹھنڈا نہ ہؤا جب مشرقی پنجاب میں مشق ستم کیلئے کوئی مسلمان باقی نہ رہا تو پھر دہلی اور یوپی کے مسلمانوں کی باری آئی اور لاکھوں مسلمان وہاں بھی تباہ اور برباد ہوئے اور اس وقت بھی ساڑھے چار کروڑ مسلمان انڈین یونین میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر زندگی کے بُرے بھلے دن کاٹ رہے ہیں۔

اب رہا پاکستان! مسلمانوں کے سامنے اس وقت پاکستان کی تعمیر کا کام

ہے۔ اگر پاکستان مضبوط ہو گیا تو انشاء اللہ انڈین یونین میں بسنے والے ساڑھے چار کروڑ فرزندانِ اسلام کی زندگی اور آبرو بھی محفوظ ہو جائے گی۔ پاکستان کی ترقی کے راستے میں اس وقت وہ تمام مشکلات حائل ہیں جو ایسے حالات میں ایک نئی سلطنت کے راستے میں حائل ہُوا کرتی ہیں لیکن جب گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگنے کا خوف ہو تو پھر اس گھر کا خدا حافظ!

اس وقت پاکستان میں کمیونسٹ خیال کے کچھ نوجوان جو عرف عام میں "ترقی پسند" کہلاتے ہیں چپکے چپکے پاکستان کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر کسانوں اور مزدوروں کے مونس اور غمگسار بنے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ سب ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور والی بات ہے۔

"کمیونزم" کا سرچشمہ روس ہے یہ وبا وہیں سے دوسرے ملکوں میں پھیلی ہے اور ہندوستان میں بھی وہیں سے اس کے جراثیم آئے ہیں۔ جہاں تک عالم اسلام اور ہندوستان کا تعلق ہے جب تک ملک تقسیم نہیں ہُوا تھا یہ لوگ اجتماعی طور پر ملک کے مختلف فرقوں میں تقریر اور تحریر سے منافرت پھیلاتے تھے۔ ملک تقسیم ہو جانے کے بعد ان کی تمام سرگرمیاں اس طرف مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں یعنی پاکستان کو پھر ہندوستان میں شامل کر دیا جائے۔

آج ملک میں جو تحریک ترقی پسندی کے نام سے چل رہی ہے۔ یہ بھی کمیونزم کا پرتو ہی تو ہے۔ اس میں زیادہ تر نوجوان لڑکے اور جوان لڑکیاں

شامل ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسی تحریک کے علم بردار ہیں جسے نہ اسلام سے واسطہ ہے
اور نہ قوم وملّت سے کچھ سروکار! بلکہ یہ لوگ نظم اور نثر کے ذریعہ ملک
میں بداخلاقی کی تعلیم عام کر رہے ہیں۔ اور کفر و الحاد کے بیج بوتے ہیں جہاں
تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان ترقی پسندوں کی عملی ہمدردیاں مسلمانوں کی
نسبت غیر مسلمانوں سے زیادہ ہیں اور تحریر اور تقریر سے پاکستان اور مسلمان
کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آج سے بہت عرصہ پیشتر جب ترقی پسند ادب کا کبھی
اخبارات میں ذکر آجاتا تھا تو ایک روز حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے ایک صحبت
میں کھلے الفاظ میں یہ فرمایا کہ اس قسم کا ادب قوم اور ملک کے زوال کا باعث
ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے ہر گورنمنٹ اس کی ترویج کو قانوناً ممنوع قرار دیتی ہے۔
روس میں جو اس تحریک کا سرچشمہ ہے کسی ادیب۔ شاعر یا مصنف کی
مجال نہیں کہ اپنی حکومت کے خلاف کچھ لکھ سکے لیکن یہاں پاکستان میں ہر
محکمہ میں یہ ترقی پسند یا کمیونسٹ کم و بیش پائے جاتے ہیں خصوصیت سے
پاکستان ریڈیو پر تو یہ کالی بدلی کی طرح چھائے ہوئے ہیں اور نئے نئے انداز
سے اپنی تحریک کا پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور جس جس طرح پاکستان کی جڑوں
پر کلہاڑا چلا رہے ہیں اگر مسلمانوں نے اس گروہ سے اسی طرح بے پرواہی
برتی تو وہ دن بھی دور نہیں جب یہ ترقی پسند مسلمانوں کیلئے گورکن ثابت ہونگے۔

پاکستان کی تعمیر کیلئے ایک ایسے تعمیری پروگرام کی ضرورت ہے جس میں
مذہب کو سب سے مقدم جگہ ملے کیونکہ جب تک کوئی قوم مذہب کا دامن
نہیں تھامتی اس کی ترقی کے تمام راستے اس پر تنگ ہو جاتے ہیں مشرقی

پنجاب میں مسلمانوں کا جو حشر ہؤا یہ ایک عذاب تھا اور قدرت کا یہ آئین ہے کہ جب کوئی قوم مذہب اور اخلاق کی طرف سے بے پرواہی برتنے لگتی ہے۔ اور مادی قوتوں کا سہارا ڈھونڈھتی ہے تو اُسے جھنجھوڑنے کے لئے۔ یا خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کیلئے مبتلائے عذاب کیا جاتا ہے ٭

سکھوں سے ہمارے یوں پٹ جانے کا سب سے بڑا باعث بھی یہی ہے کہ ہم مذہب سے کورے ہو چکے ہیں۔ کیا ستم ہے کہ وہ مسلمان جو کبھی موت سے کھیلا کرتا تھا آج موت سے ڈر کر ادھر اُدھر بھاگا پھرتا ہے۔ بیشک ہم کمزور ہیں اور دشمن ہر نقطہ نظر سے ہم سے بہت طاقتور ہے لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بقول حکیم ملت علامہ اقبالؒ ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

وہ سامان کیا ہے؟ وہ سامان ہے۔ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ! اگر آج ہم اسلام کا دامن تھام لیں تو انشاءاللہ دُنیا کی کوئی طاقت ہمارے مقابلے میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں لا سکتی —

پاکستان زندہ باد!

خواجہ بدرالسلام فروغی پرنٹر و پبلشر نے استقلال پریس لاہور میں
چھپوا کر دار البلاغ لاہور سے شائع کی